الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

بڑا کام صرف وہ لوگ کرتے ہیں جو
اپنے آپ کو چھوٹا کام کرنے پر راضی کر سکیں

نومبر ۱۹۹۲ شمارہ ۱۹۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

نومبر ۱۹۹۲ شمارہ ۱۹۲

اللہ کا بندہ	۴	زندگی کا المیہ	۱۳
جنت اور اہل جنت	۵	بڑی اسٹوری	۱۴
عدالت کا سامنا	۶	ایک لطیفہ	۱۵
حدیث کی زبان	۷	عبرت ناک	۱۶
صحابی کا عمل	۸	تاریخ کا سبق	۱۷
نفسیاتی قلعہ	۹	برداشت کا مسئلہ	۲۰
کراہیت موت	۱۰	تخریبی منصوبہ	۲۲
اسلوب کلام	۱۱	سفرنامہ — ۴	۲۳
پہلے آپ	۱۲	خبرنامہ اسلامی مرکز	۴۸

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi - 110 013
Telephone : 697333, 611128
Fax : 91-11-3312601 (Attn : Tel. 697333)
Annual Subscription :
Inland Rs 60 Abroad $20 / £10 (Air Mail)

اللہ کا بندہ

صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب میں باب فضل الضعفا، والخاملین (کمزور اور گم نام آدمیوں کا باب) کے تحت حسب ذیل روایت نقل کی گئی ہے :

عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: رُبَّ اشعث (اغبر) مدفوعٍ بالابواب لو اقسم علی اللہِ لابرَّہٗ

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بہت سے پریشان بال، گرد آلود، دروازوں سے دھکیلے ہوئے لوگ ہیں، اگر وہ اللہ کے اوپر قسم کھالیں تو اللہ ان کی قسم کو پورا کرے گا۔

یہاں یہ سوال ہے کہ ایک شخص اللہ کا مقبول بندہ ہوتے ہوئے انسانوں کے نزدیک نامقبول کیوں بن جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا شخص عوام سے مصالحت نہیں کرتا۔ وہ عوامی ذوق کی باتیں نہیں کرتا۔ وہ عام انسانوں کی پسند اور ناپسند کو معیار بنا کر دنیا میں نہیں رہتا۔ وہ اللہ کی طرف دیکھتا ہے نہ کہ عوام کی طرف۔

ایسے انسان کا انجام ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ وہ عوامی مجالس سے دور رہتا ہے، اس لیے وہ عوام کے درمیان اجنبی بن جاتا ہے۔ وہ بے آمیز حق کی بات کرتا ہے، اس لیے وہ ان لوگوں کے یہاں مقام نہیں پاتا جو ملاوٹی حق کو اختیار کیے ہوئے ہوں۔ وہ بھیڑ کی خواہشوں کا ساتھ نہیں دیتا، اس لیے بھیڑ بھی اس کو اپنے اسٹیج پر نمایاں کرنے پر راضی نہیں ہوتی۔ ایسا آدمی اپنے رب سے جڑا ہوا ہوتا ہے، مگر عین اسی وقت وہ عوامی بھیڑ سے کٹ جاتا ہے۔

سب سے بڑی قربانی اپنی غیر مقبولیت پر راضی ہونا ہے، اور مذکورہ آدمی یہی قربانی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے یہاں اس کا درجہ اتنا بلند ہو جاتا ہے کہ اللہ کے اعتماد پر اگر وہ قسم کھالے اور یہ کہہ دے کہ اللہ ضرور ایسا کرے گا تو اللہ کو غیرت آتی ہے کہ وہ اپنے اس بندہ کی اس قسم کو پورا نہ کرے۔

جو آدمی اللہ کی خاطر اس طرح لوگوں کے درمیان غیر مقبول ہو جائے، وہ اللہ کا مقبول بندہ بن جاتا ہے۔ اللہ کو اس سے غیرت آتی ہے کہ وہ ایسے بندہ کی دعا کو پورا نہ کرے۔

جنّت اور اہلِ جنّت

جنّت کیا ہے۔ جنّت عجیب و غریب نعمتوں کی ایک دنیا ہے جو عجیب و غریب انسانوں کو
وت کے بعد کے مرحلۂ حیات میں دی جائے گی۔ جنّت خدا کا انتہائی خصوصی انعام ہے جو خدا کے
نتہائی خصوصی بندوں کو ان کے انتہائی خصوصی عمل کے بدلے میں انھیں ملے گا۔

یہ خصوصی بندے وہ ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کے موجودہ امتحانی مرحلہ میں حقائق کی سطح پر جینے
کا ثبوت دیا۔ جنھوں نے خدا کی نشانیوں میں خدا کے وجود کو پالیا۔ جنھوں نے اپنے جیسے ایک انسان کو
داعیٔ حق کے روپ میں دریافت کیا۔ جو خدا کو دیکھے بغیر خدا کے آگے ڈھ پڑے۔

یہ وہ انوکھے انسان ہیں جن کو انا کے ساتھ پیدا کیا گیا تھا مگر انھوں نے حق کی خاطر اپنے آپ کو
بے انا کر لیا۔ جن کو قول و عمل کی پوری آزادی حاصل تھی مگر انھوں نے خود اپنے فیصلہ سے اپنے آپ کو پابند
نا لیا۔ جنھوں نے بظاہر اپنی محنت سے حاصل کیا اور پھر اپنے تمام حاصل کو خدا کے خانہ میں ڈال دیا۔

یہ وہ نادر ہستیاں ہیں جن کے صبح و شام غیر اللہ کے درمیان گزرے مگر انھوں نے صبح و شام
پنے رب کو یاد کیا۔ جن کو دوسرے انسانوں پر قدرت ملی مگر اللہ کے خوف نے ان کی زبان اور ان کے
ھ پر روک لگا دی۔ جن کے نفس میں غصہ اور انتقام کا طوفان اٹھا مگر اللہ کی پکڑ کے احساس نے
ن کے سینہ کی آگ کو ٹھنڈا کر دیا۔

یہ وہ قیمتی انسان ہیں جن کا حال یہ تھا کہ ان کو اس وقت پچھلی سیٹ پر بیٹھنے میں لذت ملی جب
لہ دوسرے لوگ اگلی سیٹ پر بیٹھنے کے حریص بنے ہوئے تھے۔ جنھوں نے اپنے آپ کو اس وقت
نیا دوں میں دفن کیا جب کہ دوسرے لوگ گنبدوں پر جگہ لینے کے لیے دوڑ لگا رہے تھے۔

یہ وہ نفیس روحیں ہیں جنھوں نے ذاتی تعصبات سے اوپر اٹھ کر چیزوں کو دیکھا۔ جنھوں نے
پنے آپ کو حذف کر کے لوگوں کے ساتھ خالص اصولوں کی بنیاد پر معاملہ کیا۔ جو شکایت اور اختلاف
کے وقت بھی انصاف کے راستہ سے نہیں ہٹے۔ جنھوں نے ہر قسم کے مفادات کو نظر انداز کر کے اپنے
لیے وہ روش پسند کی جو حق و صداقت کے عین مطابق تھی۔

جنّت خدا کا باغ ہے۔ وہ اس انسان کے لیے ہے جو خدا کے پھول کی مانند دنیا میں رہا ہو۔

عدالت کا سامنا

مسٹر منوہر جے پھیروانی گورنمنٹ آف انڈیا میں ایک افسر تھے۔ ترقی کرتے کرتے وہ یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا اور نیشنل ہاوسنگ بینک کے چیرمین ہو گئے۔ یہ بہت بڑا مالی عہدہ تھا۔

رزرو بینک آف انڈیا نے ۱۹۹۱ میں سرکلر جاری کیا کہ بینکوں کا فنڈ اسٹاک مارکٹ میں منتقل نہ کیا جائے۔ مگر مسٹر پھیروانی نے اس کا لحاظ نہیں کیا۔ انھوں نے قانون اور ضابطہ کے خلاف ایک بروکر کو تین ارب روپیہ سے زیادہ (Rs 3,078.63 crore) کی رقم چیک پر دیدی۔ یہ معاملہ پکڑ میں آگیا۔ گورنمنٹ کی طرف سے ان کی سخت باز پرس ہوئی۔ ۹ مئی ۱۹۹۲ کو انھوں نے اپنے عہدہ سے استعفا دے دیا (ہندستان ٹائمس ۲۲ مئی ۱۹۹۲، ۳ جون ۱۹۹۲)

ان کا کیس سی بی آئی کو دے دیا گیا۔ سی بی آئی کی ایک ٹیم ان کی چھان بین کرنے لگی۔ یہ صورت حال ان کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ ان کو سخت اندیشہ تھا کہ وہ عدالت میں اپنے آپ کو بری الذمہ ثابت نہ کر سکیں گے۔ یہ احساس ان کے لیے اتنا اعصاب شکن ثابت ہوا کہ استعفا کے بارھویں دن ۲۱ مئی ۱۹۹۲ کو ان کے اوپر دل کا شدید دورہ پڑا اور صرف پانچ منٹ بعد ان کا خاتمہ ہو گیا۔ بوقت انتقال ان کی عمر ۵۸ سال تھی :

He complained of uneasiness around 2.25 a.m. and collapsed within five minutes. He was 58.

یہ انسان کی عدالت کا سامنا کرنے کا مسئلہ تھا جس نے مسٹر پھیروانی کو اتنا زیادہ بدحواس کر دیا۔ مگر ایک اور مسئلہ اس سے کہیں زیادہ بڑا ہے۔ یہ خدا کی عدالت کا سامنا کرنے کا مسئلہ ہے۔ انسانی عدالت کے سامنے کھڑا ہونے کا احساس آدمی کو اس قدر گھبرا دیتا ہے۔ پھر اس وقت آدمی کا کیا حال ہوگا جب کہ وہ خدائی عدالت کے سامنے کھڑا کیا جائے گا۔

جو موت آدمی کو انسانی عدالت کی پکڑ سے بچا لیتی ہے۔ وہی موت زیادہ شدید طور پر آدمی کو خدائی عدالت کی پکڑ میں دے دے گی۔ کتنا سنگین ہے یہ معاملہ۔ آدمی اگر اس کو سوچے تو اس کے اندر تمام زلزلوں سے زیادہ بڑا زلزلہ آجائے۔

حدیث کی زبان

ڈاکٹر موریس بکائی (Maurice Bucaille) نے قرآن کی صداقت کے بارہ میں کئی کتابیں اور مضامین شائع کیے ہیں۔ انھوں نے سائنسی دلائل کے ذریعے ثابت کیا ہے کہ قرآن خدا کی کتاب ہے۔ ان کی یہ تحریریں بے حد مفید ہیں۔

مگر وہ قرآن اور حدیث میں فرق کرتے ہیں۔ قرآن کی صداقت کو مانتے ہوئے حدیث کے بارہ میں انھوں نے شبہات کا اظہار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ حدیث کی کتابوں میں کچھ صحیح روایتیں ہیں۔ اور کچھ حدیثیں ایسی ہیں جو یا تو مشتبہ ہیں یا اس قابل ہیں کہ انھیں بالکل رد کر دیا جائے،

... which are either dubious, or should be rejected outright. (p. 243)

مثال کے طور پر ایک حدیث میں ہے کہ گرمی کی شدت جہنم کی پھونک کی وجہ سے ہے (اِنَّ شِدَّةَ الْحَرِّ مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ) انھوں نے اس حدیث کو بالکل لفظی طور لے لیا، اس لیے اس کی معنویت ان کی سمجھ میں نہ آسکی۔ حالاں کہ یہ اور اس طرح کی دوسری حدیثیں تمثیل کی زبان میں ہیں۔

وضاحت کے لیے ایک اور مثال لیجئے۔ عرب میں یہ رواج تھا کہ جنازہ میں صاحب حیثیت لوگ سواری پر چلا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک بار دیکھا کہ جنازہ جا رہا ہے اور بعض افراد گھوڑے پر سوار ہو کر اس کے ساتھ چل رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا: کیا تمہیں شرم نہیں آتی کہ فرشتے تو پیدل ہیں اور تم سواری پر جا رہے ہو (سنن ابن ماجہ)

اس کا مطلب یہ نہیں کہ فرشتے فی الواقع ہماری طرح پیر رکھتے ہیں اور وہ اپنے پیروں سے چل کر جنازہ کی مشایعت کر رہے تھے۔ آپ نے تمثیل کی زبان میں اس پہلو کی طرف توجہ دلائی کہ ایک شخص اپنی مدت امتحان پوری کر کے عالم آخرت کی طرف جا رہا ہو تو یہ وقت عجز و فروتنی کا ہوتا ہے۔ اور اس قسم کی نفسیات کی رعایت صرف اس وقت ہوتی ہے جب کہ جنازہ کے ساتھ پیدل چلا جائے۔ یہ خدا کے بندوں کے لیے پیدل چلنے کا وقت ہوتا ہے نہ کہ "سواری" پر بیٹھ کر سفر طے کرنے کا۔

حدیث میں جو تمثیلیں ہیں وہ سب برائے وضاحت ہیں۔ ان کو ان کی اصل حقیقت کے اعتبار سے لینا چاہیے نہ کہ ان کی ظاہری صورت کے اعتبار سے۔

صحابی کا عمل

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ یہاں ہم بخاری اور ترمذی کے الفاظ نقل کرتے ہیں:

عن ابی بکرۃ رضی اللہ عنہ قال۔ لقد نفعنی اللہ بکلمۃ سمعتہا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایام الجمل بعد ما کدت ان الحق باصحاب الجمل فاقاتل معہم۔ قال لما بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اہل فارس ملکوا علیہم بنت کسریٰ قال: لن یفلح قوم ولوا امرہم امرأۃ (رواہ البخاری)

وفی روایۃ الترمذی قال: عصمنی اللہ عزوجل بشیء سمعتہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ لما ہلک کسریٰ قال من استخلفوا۔ قالوا ابنتہ۔ فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: لن یفلح قوم ولوا امرہم امرأۃ۔ فلما قدمت عائشۃ، یعنی البصرۃ، ذکرت قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فعصمنی اللہ بہ۔

حضرت ابوبکرہ کہتے ہیں کہ اللہ نے ایک قول کے ذریعہ مجھ کو جنگ جمل کے زمانہ میں فائدہ پہونچایا۔ قریب تھا کہ میں اصحاب جمل سے مل جاؤں اور ان کے ساتھ جنگ کروں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ بات پہنچی کہ اہل فارس نے اپنے اوپر کسریٰ کی لڑکی کو حاکم بنایا ہے تو آپ نے فرمایا کہ وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی جو عورت کو اپنے معاملہ کا حاکم بنائے۔

ترمذی کی روایت کے مطابق انھوں نے کہا کہ اللہ نے مجھے ایک چیز کے ذریعہ بچالیا جس کو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا۔ جب کسریٰ کی موت ہوئی تو آپ نے پوچھا کہ انھوں نے کس کو اس کا جانشین بنایا۔ لوگوں نے کہا کہ اس کی لڑکی کو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی جو عورت کو اپنے معاملہ کا حاکم بنائے۔ راوی کہتے ہیں کہ جب عائشہ بصرہ آئیں تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کو یاد کیا تو اللہ نے اس کے ذریعہ سے مجھ کو بچالیا۔

حضرت عائشہ کی حیثیت ام المومنین کی تھی۔ اس کے باوجود جب عائشہ کی بات اور رسول کی بات میں ٹکراؤ ہوا تو صحابی نے عائشہ کو چھوڑ کر رسول کی بات کو پکڑ لیا۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ ہر حال میں اپنے "اکابر" کا ساتھ دیتے ہیں، خواہ ان کے اکابر کی روش قرآن وسنت کے تقاضوں کے سراسر خلاف ہو۔

نفسیاتی قلعہ

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اٰمُرُکُم بِذِکرِ اللہِ کثیراً وَمَثَلُ ذٰلکَ کَمَثَلِ رَجُلٍ طَلَبَهُ العَدُوُّ سِرَاعاً حتّٰى اَتٰى حِصناً حَصِيناً فَاَحرَزَ نَفسَهُ فِيهِ. وَكَذٰلكَ العَبدُ لَا يَنجُو مِنَ الشَّيطانِ اِلَّا بِذِكرِ اللهِ۔

(الترمذی)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں تم کو زیادہ سے زیادہ اللہ کا ذکر کرنے کی تلقین کرتا ہوں اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی کا اس کے دشمن نے تیزی سے پیچھا کیا۔ یہاں تک کہ وہ بھاگ کر ایک مضبوط قلعے میں داخل ہوگیا۔ اس طرح اس نے قلعہ بند ہو کر اپنے آپ کو بچالیا۔ یہی معاملہ بندہ کا ہے۔ وہ صرف اللہ کی یاد ہی کے ذریعہ شیطان سے بچ سکتا ہے۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ انسان کو سب سے زیادہ گمراہ کرنے والا اس کا دشمن شیطان ہے۔ اس سب سے بڑے دشمن سے بچنے کی تدبیر صرف یہ ہے کہ آدمی ہمیشہ اللہ کا ذکر کرتا رہے۔

ذکر سے مراد کچھ مقرر کلمات کا ورد نہیں ہے۔ اس قسم کی لسانی ورزش کا مذکورہ ذکر سے کوئی تعلق نہیں۔ معروف قسم کا وِرد یا تکرارِ الفاظ کسی بھی درجہ میں آدمی کو شیطان کے بہکاوے سے بچانے والے نہیں اور نہ وہ کسی کے لئے شیطانی حملوں کے مقابلہ میں حفاظت کا قلعہ بن سکتا ہے۔

ذکر سے مراد دراصل یاد ہے۔ یعنی اللہ کے تصور کا آدمی کے ذہن پر اتنا غلبہ ہو جانا کہ وہی اس کی مستقل سوچ بن جائے۔ آدمی کو ہر وقت خدا کے کمالات اور اس کی عظمتوں کا احساس ہوتا رہے۔ دنیا کے ہر منظر میں اس کو خدا کی جھلک دکھائی دے۔ کائنات کی ہر آواز میں اس کو خدا کا نغمہ سنائی دے۔ وہ ہر واقعہ اور ہر تجربہ سے اپنے لیے ربانی سبق لیتا رہے۔

آدمی جب اس طرح خدا کو یاد کرنے لگتا ہے تو اس کا ذہن خدائی حقیقتوں کے بارہ میں جاگ اٹھتا ہے۔ اس کے اندر صحیح اور غلط کا شعور پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر ایک قسم کا ذہنی روک یا نفسیاتی قلعہ بن جاتا ہے جس کے اندر وہ شیطان سے محفوظ ہو کر رہ سکے۔ جو آدمی اس طرح اللہ کی یاد میں جینے لگے اس پر قابو پانا شیطان کے لیے ممکن نہیں۔

کراہیت موت

سنن ابی داؤد (کتاب الملاحم، باب فی تداعی الامم علی الاسلام) میں ثوبان رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی گئی ہے۔ اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ وقت آنے والا ہے جب قومیں تمہارے خلاف پکاریں جس طرح کھانے والے کھانے کے پیالہ کی طرف پکارتے ہیں۔ ایک کہنے والے نے کہا کہ کیا اس دن ہم کم ہوں گے۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں، بلکہ اس وقت تم بہت زیادہ ہوگے۔ مگر تم لوگ جھاگ ہوگے، سیلاب کے جھاگ کی طرح۔ اور اللہ تمہارے دشمنوں کے دل سے تمہارا خوف نکال دے گا۔ اور اللہ تمہارے دلوں میں کمزوری ڈال دے گا۔ ایک کہنے والے نے کہا کہ اے خدا کے رسول، وہ کمزوری کیا ہے۔ آپ نے فرمایا: دنیا کی محبت اور موت کو ناپسند کرنا۔

اس حدیث میں امت کے دورِ زوال کی پیشگی خبر دی گئی ہے۔ اس دور میں مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگی۔ مگر وہ ایک کمزوری کا شکار ہونے کی بنا پر بے وزن ہو جائیں گے۔ وہ کمزوری یہ ہے کہ دنیا کا مفاد ان کی نظر میں بے حد عزیز ہو جائے گا۔ حتی کہ مفاد کے خلاف جانا انھیں ایسا لگے گا جیسے کہ وہ اپنی موت کی طرف جا رہے ہوں۔

عوام کی نظر میں سب سے زیادہ اہمیت ان کے مادی مفاد کی ہو جائے گی، کیوں کہ حق کے تقاضوں پر چلنے میں وہ اپنی معاشی بربادی محسوس کریں گے۔ قائدین اپنی قوم کی غلطیوں کے خلاف بولنا چھوڑ دیں گے، کیوں کہ انھیں دکھائی دے گا کہ ایسا کرنا اپنے آپ کو قیادتی ہلاکت کے خطرہ میں مبتلا کرنا ہے۔ لوگ قربانی کے بجائے رخصت کے طریقے پر چل پڑیں گے، کیوں کہ قربانی کے طریقہ میں انھیں اپنی دنیوی موت نظر آئے گی۔ لوگ اصول پسندی کے بجائے مصلحت پرستی کو اپنا شیوہ بنالیں گے، کیوں کہ ان کا یہ احساس ہوگا کہ مصلحت پرستی میں ان کی ترقی ہے اور اصول پسندی میں ان کی موت۔

یہ صفات آدمی کو خود پسند بناتی ہیں۔ ایسے لوگوں کو صرف اپنے ذاتی مفاد کی خبر ہوتی ہے انھیں پوری قوم کے مفاد کی خبر نہیں ہوتی۔ ان کے اندر یہ استعداد ختم ہو جاتی ہے کہ وہ دوسروں سے جڑ کر متحدہ طاقت بن سکیں۔ مجموعی طور پر کثیر تعداد ہونے کے باوجود اس کا ہر فرد اکیلا اکیلا ہو کر رہ جاتا ہے۔

اسلوب کلام

عن ابن مسعود ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لقوم یتخلفون عن الجمعۃ: لقد ھممت ان آمر رجلاً یصلی بالناس ثم احرق علی رجال یتخلفون عن الجمعۃ بیوتھم۔

(مسلم بحوالہ مشکاۃ ۱/۴۳۵)

عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کی بابت فرمایا جو جمعہ کی نماز میں نہیں آتے کہ میں نے ارادہ کیا کہ میں کسی شخص سے کہوں کہ وہ نماز پڑھائے اور پھر میں جاکر ان لوگوں کے گھروں کو جلادوں جو جمعہ میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔

اس حدیث کے ظاہر الفاظ سے معلوم ہوتا ہے جو لوگ جمعہ کی نماز کے لیے مسجد میں نہ آئیں ان کے گھروں میں آگ لگا کر ان کو ان کے گھر کے سمیت جلا دینا چاہیے۔ مگر ایسے لوگوں کے ساتھ اس قسم کی کارروائی نہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمائی اور نہ آپ کے بعد اسلام کی لمبی تاریخ میں کبھی ایسا کیا گیا اور نہ علماء نے کبھی یہ فتویٰ دیا کہ تارکِ جمعہ کے گھر میں آگ لگا کر اس کو جلادو۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے الفاظ کبھی ظاہری مفہوم کے اعتبار سے بولے نہیں جاتے بلکہ وہ شدتِ احساس کو بتانے کے لیے بولے جاتے ہیں۔ ان الفاظ کو ان کے حقیقی مفہوم کے اعتبار سے لینا چاہیے نہ کہ محض ظاہری الفاظ کے اعتبار سے۔

ہر کلام اصلاً کسی مفہوم کو ادا کرنے کے لیے بولا جاتا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ہر کلام کا ایک اسلوب ہوتا ہے اور یہ اسلوب متکلم کے احساس کا مظہر ہوتا ہے۔ اگر آدمی کسی بات سے شدید طور پر متاثر ہو تو اس کے احساس کی جھلک اس کے بولے ہوئے الفاظ میں بھی آجائے گی۔ اس نکتہ کو ملحوظ رکھے بغیر کسی کلام کی اصل نوعیت کو سمجھا نہیں جاسکتا۔

سننے والا اگر سنجیدہ ہو تو متکلم کی بات کو سمجھنے میں اسے کوئی زحمت پیش نہیں آئے گی۔ مگر جو لوگ سنجیدہ اور محتاط نہ ہوں وہ ہر کلام کا الٹا مطلب نکال سکتے ہیں، خواہ وہ اللہ اور رسول کا کلام کیوں نہ ہو۔

پہلے آپ

ڈاکٹر سوجات موکو انڈونیشیا کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ پروفیسر تھے۔ وہ جکارتا یونیورسٹی میں ایک علمی موضوع پر لکچر دے رہے تھے۔ عین لکچر کے دوران ان پر دل کا دورہ پڑا۔ وہ اسٹیج ہی پر گر پڑے اور اسی وقت وفات پاگئے۔ وہ پہلے ایشیائی تھے جو اقوام متحدہ کی امن یونیورسٹی (ٹوکیو) کے پریسیڈنٹ مقرر ہوئے۔ انھوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں:

Prof Dr. Soedjatmoko, one of the leading intellectuals of Indonesia while delivering a lecture at a University campus, in Jogjakarta, had a heart attack, collapsed and expired. He was the first Asian to become the President of UN's Peace University in Tokyo. He has written a number of books.

ڈاکٹر سوجات موکو کا کیس موجودہ دنیا میں ہر آدمی کا کیس ہے۔ پریس اور میڈیا اور پلیٹ فارم کے ظہور نے ہر آدمی کو بولنے کے لامتناہی مواقع دیدیئے ہیں۔ ہر آدمی صبح و شام بولنے میں مصروف ہے۔

آج ہر آدمی دوسروں کو سنا رہا ہے۔ حالاں کہ خدا کے بھیجے ہوئے فرشتے ہر آدمی کی طرف آرہے ہیں تاکہ اس کو لے جاکر وہاں کھڑا کردیں جہاں اس کو صرف سننا ہے، سنانے کا موقع آخری طور پر اس کے لیے ختم ہو چکا ہے۔

علم لفظوں سے واقفیت کا نام نہیں ہے بلکہ معانی سے واقفیت کا نام ہے۔ اس دنیا میں سب سے بڑا کام بولنا نہیں ہے بلکہ سب سے بڑا کام چپ رہنا ہے۔ یہاں اصل اہمیت اظہار رائے کی نہیں ہے بلکہ اظہار رائے سے پہلے سوچنے کی ہے۔

بولنے والا حقیقۃً وہ ہے جو اپنے آپ سے بولے۔ بتانے والا وہ ہے جو اپنے دماغ کو سوچنے میں لگائے ہوئے ہو۔ دوسروں کو نصیحت کرنے والا وہ ہے جو دوسروں کو نصیحت کرنے سے پہلے اپنے آپ کو نصیحت کرے، جو دوسروں کو مخاطب کرنے سے پہلے اپنا مخاطب خود بن جائے۔ جو دوسروں پر بلڈوزر چلانے کا نعرہ لگانے سے پہلے خود اپنی ذات پر بلڈوزر چلا چکا ہو۔

دوسروں کو مخاطب کرنا سب سے آسان کام ہے اور اپنے آپ کو مخاطب کرنا سب سے مشکل۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس راز کو جانتے ہوں۔

زندگی کا المیہ

مسٹر ستیہ جیت رے (Satyajit Ray) مئی ۱۹۲۱ میں کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے فلمی صنعت کو اپنا میدانِ کار بنایا۔ اس میدان میں انھوں نے اتنی ترقی کی کہ ان کو ماسٹر آف انڈین سینما کہا جانے لگا۔ چالیس سال تک وہ فلمی دنیا پر چھائے رہے۔ ۲۳ اپریل ۱۹۹۲ کو کلکتہ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ٹائم میگزین (۴ مئی ۱۹۹۲) نے ان کو ماسٹر فلم میکر کہا ہے۔

اپنی اعلیٰ کارکردگی کو ثابت کرنے میں مسٹر ستیہ جیت رے کو اپنی عمر کے ۱، سال صرف کرنے پڑے۔ آخر کار وہ وقت آیا کہ انھیں ممتاز انعامات دے کر ان کا اعتراف کیا جائے۔ موت سے صرف ایک ماہ پہلے ان کو ملک کے اعلیٰ ترین اعزاز "بھارت رتن" سے سرفراز کیا گیا۔ مگر اس وقت وہ اس قابل نہ تھے کہ اعزاز کی تقریب میں شرکت کے لیے کلکتہ سے دہلی کا سفر کریں۔ اسی طرح امریکہ کی اکیڈمی آف موشن پکچرز کا عالمی انعام اوسکر ایوارڈ (Oscar Award) دینے کے لیے ان کا انتخاب کیا گیا۔ مگر یہ بھی ان کی آخری عمر میں ہوا۔ چنانچہ اس اعلیٰ انعام کو لینے کے لیے بھی وہ لاس اینجلیز نہ پہنچ سکے۔

ستیہ جیت رے کی موت کے بعد ان کے بارہ میں ریڈیو اور ٹیلی وژن پر غیر معمولی پروگرام جاری کیے گئے۔ اخبارات نے کئی کئی صفحے کے تذکرے شائع کیے۔ دی اسٹیٹسمین (۲۴ اپریل ۱۹۹۲) نے اپنے ایڈیٹوریل میں ان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا کہ یہ بڑی دردناک ستم ظریفی تھی کہ موت نے انڈیا کے ایک لائق ترین شخص کو عین اس وقت چھین لیا جب کہ وہ اپنی عظمت کے بہترین مقام پر تھے :

It was cruel irony that death should have snatched one of India's greatest talents at his finest moment of glory.

دنیا میں آدمی پُرمشقت عمل کر کے اپنا ایک مینار کھڑا کرتا ہے۔ مگر جب وہ اس کی چوٹی پر پہنچ جاتا ہے اور لوگ اس کا اعتراف کرنے لگتے ہیں، عین اس وقت موت اس کی کامیابیوں کی نفی کر دیتی ہے۔ پایا ہوا انسان اچانک ایک کھویا ہوا انسان بن جاتا ہے۔

بڑی اسٹوری

ٹائم انٹرنیشنل امریکہ سے نکلنے والا مشہور ہفتہ وار میگزین ہے۔ اس کے ہر شمارہ میں ایک خصوصی مضمون ہوتا ہے۔ اس مضمون کو صفحہ اول پر نمایاں کیا جاتا ہے، اس لیے اس کو کور اسٹوری (cover story) کہتے ہیں۔

ٹائم کے شمارہ ۸ جون ۱۹۹۲ کے صفحہ ۲ پر اس کے مستقل عنوان (from the publisher) کے تحت آدھے صفحہ کا ایک نوٹ ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ٹائم میں کور اسٹوری لکھنا گویا بڑی اسٹوری لکھنا ہے۔ اور بڑی اسٹوری لکھنا وہ چیز ہے جس کو لکھنے کا خواب ہر صحافی دیکھتا رہتا ہے :

Every journalist dreams of working on the big story.

اخبار یا میگزین میں بڑی اسٹوری لکھنا یا کسی بڑے واقعہ کی رپورٹنگ کرنا صحافی کا خواب ہے۔ تاہم صحافی کا یہ خواب اس کی ذاتی خوشی کے لیے ہوتا ہے جس کو ٹائم کے ایک رپورٹر میگنوس (Ed Magnuson) نے حقیقی خوشی (real pleasure) سے تعبیر کیا ہے۔

مگر ایک اور طبقہ ہے جو بڑی اسٹوری ذاتی خوشی کے لیے نہیں بلکہ ذاتی نمائش کے لیے لکھتا ہے۔ وہ بڑی اسٹوری اس لیے لکھنا چاہتا ہے کہ اس کی ذات کو بڑائی حاصل ہو۔ اس کی شخصیت دوسروں کے مقابلہ میں نمایاں ہو جائے، یہ لیڈروں کا طبقہ ہے۔ صحافی کا ذاتی خوشی کے لیے بڑی اسٹوری لکھنا کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ مگر لیڈر کا ذاتی نمائش کے لیے بڑی اسٹوری لکھنا بلاشبہہ جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔

لیڈر قومی تعمیر کی زبان بولتا ہے۔ مگر اس کا اصل مقصد اپنی ذات کو نمایاں کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے لیڈر ہمیشہ بڑی بڑی باتیں کرتا ہے تاکہ اس کا نام زیادہ سے زیادہ چھپے، اس کے گرد زیادہ سے زیادہ لوگوں کی بھیڑ جمع ہو۔ مگر اس قسم کی لیڈری قومی تعمیر کے لیے زہر ہے۔ قومی تعمیر کا کام ہمیشہ "چھوٹی اسٹوری" لکھنے سے ہوتا ہے، اور لیڈر اپنے مزاج کی بنا پر صرف "بڑی اسٹوری" لکھنے میں دل چسپی لیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لیڈر کی شخصیت تو چمک اٹھتی ہے مگر قوم کی تعمیر و ترقی کا کام نہیں ہوتا۔

ایک لطیفہ

شیخ سعدی شیرازی (۱۲۹۲ - ۱۱۹۳) فارسی کے مشہور شاعر ہیں۔ ان کی کتابوں (گلستاں، بوستاں) کے ترجمے یورپ کی اکثر زبانوں میں ہوئے ہیں۔ ایک مستشرق ڈاکٹر ہرڈر (J.G. Herder) نے سعدی کی کتاب گلستاں کے بارہ میں لکھا ہے کہ وہ سلطان کے باغ میں اگنے والا بہترین پھول ہے۔

... the finest flower that could blossom in a Sultan's garden. (9/964)

شیخ سعدی کا ایک لطیفہ ہے۔ ایک بار وہ کاشغر میں تھے جو اس وقت چینی ترکستان کا صدر مقام تھا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب کہ تاتاریوں اور خوارزمیوں میں جنگ کے بعد عارضی صلح ہو گئی تھی۔ شیخ سعدی نے ایک مسجد میں دیکھا کہ ایک طالب علم عربی قواعد کی کتاب ہاتھ میں لیے ہوئے ہے اور ضَرَبَ زَیْدٌ عَمْرواً، ضَرَبَ زَیْدٌ عَمْرواً کا جملہ رٹ رہا ہے۔ انھوں نے طالب علم سے کہا کہ صاحبزادے، خوارزم اور خطا میں تو صلح ہو گئی، مگر زید و عمرو کی لڑائی ابھی چلی جارہی ہے۔ طالب علم ہنس پڑا اور شیخ کا وطن پوچھا۔ شیخ کی زبان سے شیراز کا نام سنا تو فرمائش کی کہ سعدی کا کچھ کلام یاد ہو تو سناؤ۔ شیخ سعدی نے حسب موقع یہ شعر موزوں کر کے پڑھا:

اے دل عشاق بدامِ تو صید ما بتو مشغول و تو با عمرو و زید

اے وہ کہ عاشقوں کے دل تیرے دام میں گرفتار ہیں، ہم تجھ میں مشغول ہیں اور تو عمرو اور زید میں مشغول ہے۔

یہ لطیفہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں جنگ کا طریقہ فرسودہ ثابت ہو چکا ہے۔ تمام ترقی یافتہ قومیں اپنے نزاعات کو گفت و شنید کے ذریعہ طے کر رہی ہیں۔ حتی کہ روس اور امریکہ نے ایک دوسرے کے خلاف اپنے ہتھیاروں کو رکھ دیا ہے۔ مگر مسلمان ہر جگہ جہاد کے نام پر بے فائدہ لڑائی میں مشغول ہیں۔

موجودہ زمانہ کا انسان تمام چیزوں سے اکتا کر دین حق کی طرف آرہا ہے۔ وہ اسلام کے سایۂ رحمت میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ مگر مسلمان لڑائی جھگڑے کے کاموں میں اتنا زیادہ مشغول ہیں کہ ان کو نہ جدید انسان کی اس طلب کی خبر ہے اور نہ اس کو استعمال کرنے کی فرصت۔

عبرت ناک

مسلم ملکوں کی ایک تنظیم ہے جس کو اسلامی کانفرنس تنظیم (آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس) کہا جاتا ہے۔ جولائی ۱۹۹۲ کے دوسرے ہفتہ میں اس کا اجلاس جدہ میں ہوا۔ یہاں ایودھیا کے مسئلہ پر ایک مذمت کا رزولیوشن پاس کیا گیا۔ اس تجویز کو پاکستان کے روزنامہ وفاق (۱۵ جولائی ۱۹۹۲) نے اپنے صفحہ اول پر اس جلی سرخی کے ساتھ چھاپا ہے: رام مندر کی تعمیر بند کرو، اسلامی کانفرنس تنظیم کا بھارت کو انتباہ۔

مگر "بھارت" میں مذکورہ تنظیم کی اس مذمت کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ ٹائمس آف انڈیا (۱۴ جولائی ۱۹۹۲) میں مسٹر دلیپ مکرجی کا ایک آرٹیکل چھپا ہے۔ اس کا آخری پیراگراف یہ ہے ——— بنیادی بات سمجھ لینے کی یہ ہے کہ مسلم دنیا خواہ اور جو کچھ ہو مگر وہ ایک نہیں ہے۔ اس کے درمیان قومی رقابتیں، سرحدی جھگڑے، فرقہ وارانہ نزاعات، اقتصادی معاملات، اور پھر بین اقوامی صف بندیاں ہیں۔ اس طرح اسلامی کانفرنس تنظیم جس میں ۴۵ مسلم ریاستیں شریک ہیں وہ تقریباً اتنی ہی غیر موثر ہے جتنا کہ کسی عملی کارروائی کے لیے نام۔ یہ بات اس حقیقت سے بخوبی واضح ہے کہ سینگال میں او آئی سی کی چوٹی کانفرنس میں متفقہ طور پر یہ طے کیا گیا کہ اقوام متحدہ کے اس رزولیوشن کی مخالفت کی جائے جس کا مقصد صیہونت کو نسل پرستی کے برابر ٹھہرانے کی قدیم قرارداد کو منسوخ کرنا ہے۔ مگر جب اقوام متحدہ میں منسوخی کا یہ رزولیوشن پیش ہوا تو ۴۵ مسلم ملکوں میں سے ۲۰ ملکوں نے یا تو اس کی تائید کی یا رائے شماری سے علٰحدہ رہے۔ ایسی حالت میں انڈیا کو اسلامی کانفرنس تنظیم کے اعلانات پر اپنی ایک نیند بھی خراب کرنے کی ضرورت نہیں:

The main point to grasp is that the Islamic world is anything but monolithic. It is deeply divided by national rivalries, territorial disputes, sectarian differences, economic circumstances and, last but not the least, international alignments. Thus, the Organisation of Islamic Conference which brings together 45 Islamic states is about as ineffective as an instrument of action as NAM. This is sharply brought out by the fact that within days of a unanimous resolution adopted at OIC's Senegal summit to vote against revoking the UN resolution equating Zionism with racism, 20 out of the 45 either voted for it or abstained. India does not, therefore, need to lose any sleep over OIC declarations. (*The Times of India*, July 14, 1992)

تاریخ کا سبق

المامون (۱۷۰ھ - ۲۱۸ھ، ۸۳۳ء - ۷۸۶ء) ساتواں عباسی خلیفہ ہے۔ وہ اپنے والد ہارون الرشید کی وفات کے بعد محرم ۱۹۸ھ میں بغداد کے تخت خلافت پر بیٹھا۔ وہ علم اور عمل دونوں اعتبار سے ممتاز صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس کا زمانہ اگرچہ جنگوں اور شورشوں کا زمانہ ہے۔ اس کے باوجود اس کے زمانہ میں علم وفن کو غیر معمولی ترقی حاصل ہوئی۔ المامون ہی نے بغداد کے مشہور بیت الحکمت کو قائم کیا تھا۔ بیت الحکمت (۸۳۰ء) ایک عظیم علمی ادارہ تھا جو کتب خانہ، تحقیقی اکیڈمی اور دار الترجمہ وغیرہ کا مجموعہ تھا (ہسٹری آف دی عربس ۳۱۰)

مامون کی زندگی کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ اس نے اپنے بعد ولی عہد مقرر کرنے کے لیے رشتہ کا لحاظ نہ کرتے ہوئے صحیح آدمی کی تلاش کی۔ ۲۰۰ھ میں اس نے آل عباس کے قابل ذکر افراد کو مرو میں جمع کیا۔ کئی مہینے تک ان کی تواضع کی۔ وہ ان میں سے کسی لائق شخص کو اپنے بعد ولی عہد مقرر کرنا چاہتا تھا۔ مگر کوئی عباسی اس کو اپنے معیار کے مطابق نظر نہ آیا۔

آخر کار اپنے وزیر الفضل کے مشورہ (الکامل فی التاریخ ۶/۱۹۷) پر اس نے بنو ہاشم کی علوی شاخ سے مناسب آدمی لینے کا فیصلہ کیا۔ تلاش اور غور وفکر کے بعد اس نے اس منصب کے لیے علی بن موسی الکاظم بن جعفر الصادق بن محمد بن الحسین بن علی بن ابی طالب کا انتخاب کیا۔

مامون نے ان کو الرضی کا خطاب دیا اور اپنے انتخاب کو مزید مضبوط کرنے کے لیے ان سے اپنی لڑکی ام حبیب کا نکاح کر دیا۔ ہارون الرشید کی وصیت کے مطابق، مامون کے بعد اس کا بھائی مؤتمن ولی عہد تھا، مگر مامون نے مؤتمن کو معزول کر دیا۔ اور علی الرضی کو اپنے بعد ولی عہد مقرر کیا۔

ابن کثیر لکھتے ہیں :

وذلك ان المامون رأى ان عليا الرضى خير اهل البيت وليس فى بنى العباس مثله فى عمله ودينه فجعله ولى عهده من بعده (البدایہ والنہایہ ۱۰/۲۴۷)

اور ایسا اس لیے ہوا کہ مامون نے دیکھا کہ علی الرضی اہل بیت میں سب سے بہتر ہیں۔ اور بنو عباس کے اندر عملی اور دینی اعتبار سے ان کے جیسا کوئی نہیں۔ پس مامون نے اپنے بعد ان کو اپنا ولی عہد مقرر کیا۔

ابن اثیر نے یہی بات ان لفظوں میں لکھی ہے کہ : انہ نظر فی بنی العباس وبنی علی فلم یجد احداً افضل ولا اورع ولا اعلم منہ (الکامل فی التاریخ ۶/۳۲۶)

یہ المامون کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ اس نے خلافت کے منصب کے لیے بنو عباس کا کوئی فرد نامزد کرنے کے بجائے علوی شاخ کا ایک فرد منتخب کیا۔ کیوں کہ اس کو نظر آیا کہ عباسی خاندان کے مقابلہ میں علوی خاندان کے اندر زیادہ اہل افراد موجود ہیں۔ مگر المامون کے اہل خاندان (بنو عباس) اس پر راضی نہ ہوئے۔ انھوں نے مختلف قسم کی سازشیں شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ، بعض روایات کے مطابق، انگور میں زہر ملا کر علی الرضی کو کھلا دیا۔ جس سے صفر ۲۰۳ھ میں ان کی موت واقع ہو گئی۔

فرانسیسی مستشرق پروفیسر ڈامینیک سورڈیل (Dominique Sourdel) نے لکھا ہے کہ المامون کے وقت مسلم دنیا شیعہ گروہ اور سنی گروہ میں بٹ گئی تھی۔ ایک طرف پیغمبر اسلام کے چچا عباس کے اہل خاندان تھے اور دوسری طرف پیغمبر کے داماد علی سے وابستہ حضرات، پوری عباسی سلطنت کا خلیفہ بننے کے بعد المامون نے طے کیا کہ وہ مسلم امت کی اس تقسیم کو ختم کرے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس نے ایک ایسا فیصلہ کیا جو اس کے معاصرین کے لیے سخت تعجب خیز تھا، حتی کہ وہ خود اس کی اپنی حیثیت کے لیے بھی نقصان دہ تھا۔ اس نے یہ کیا کہ اپنا ولی عہد مقرر کرنے کے لیے اپنے خاندان کے کسی فرد کو نہیں لیا۔ بلکہ اس نے علی الرضی کو اپنا سیاسی جانشین مقرر کیا جو کہ علی بن ابی طالب کے خاندان سے تھے۔ بظاہر دو خاندانوں کے درمیان رقابت کو ختم کرنے کے لیے المامون نے اپنی بیٹی کا نکاح بھی علی الرضی کے ساتھ کر دیا۔ دونوں کے درمیان مفاہمت کی فضا پیدا کرنے کے لیے مزید اس نے یہ کیا کہ اس نے عباسیوں کے کالے جھنڈے کو چھوڑ کر علویوں کے ہرے جھنڈے کو سرکاری طور پر اختیار کر لیا۔

مگر المامون کی ان کوششوں کا متوقع نتیجہ نہیں نکلا۔ عباسی گروہ اتنا ناراض ہوا کہ بغداد میں باقاعدہ طور پر المامون کی خلافت سے معزولی کا اعلان کر دیا گیا۔ عباسیوں نے المامون کو تخت سے ہٹا کر عباسی خاندان کے ابراہیم کو اس کی جگہ خلیفہ مقرر کر دیا۔

اس وقت المامون بغداد سے دور مرو میں تھا۔ جب یہ خبر یں پہنچیں تو وہ فوراً مرو سے چل کر بغداد کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس لمبے سفر کے دوران یہ واقعہ ہوا کہ فروری ۸۱۸ء میں اس کے وزیر

الفضل کو قتل کر دیا گیا۔ اور علی الرضی بھی زہر آلود انگور کھانے کے بعد اگست ۸۱۸ء میں اچانک مر گئے۔

علی الرضی اور ان کے حامی وزیر الفضل کی یہ اندوہناک موتیں کیوں کر ہوئیں، اس کی توجیہہ کے لیے کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ عباسیوں نے ان دونوں کو مروا دیا۔ اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ خود المامون نے اس وقت کے مخالفانہ حالات سے گھبرا کر انھیں ختم کر دیا اور حالات سے مصالحت کرتے ہوئے دوبارہ خلافت کا منصب عباسی خاندان کے حوالے کر دیا (11/417-18)

ابن خلدون نے اس تاریخی واقعہ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ کسی معاشرہ میں عمومی طور پر جب وازع دینی ضعیف ہو جائے تو اس کے بعد ایک فرد، خواہ بذات خود وہ کتنا ہی صالح ہو، وہ معاشرہ میں صلاح و فلاح کا نظام قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا (مقدمہ ابن خلدون ۲۱۱)

اس طرح کے واقعات کثرت سے تاریخ میں موجود ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ سیاسی نظام سماجی حالات کے تابع ہے۔ جیسے سماجی حالات ویسا ہی سیاسی نظام۔

یہ تاریخی حقیقت بتاتی ہے کہ جو شخص صالح افراد کے ہاتھ میں حکومت کا نظام دینا چاہتا ہو اس کو پہلے سماجی نظام میں اس کے موافق تبدیلی لانا ہوگا۔ اس تبدیلی سے پہلے کبھی صالح افراد کی سیاسی قیادت کسی معاشرہ میں قائم نہیں ہو سکتی۔

اس واضح تاریخی شہادت کے باوجود جو لوگ ایسا کریں کہ ضروری سماجی تبدیلی کے بغیر صالح سیاسی قیادت کا نعرہ لگائیں، وہ یا تو غیر سنجیدہ ہیں یا سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔

برداشت کا مسئلہ

نئی دہلی کے انگریزی روزنامہ دی پانیر (۲۴ جون ۱۹۹۲) نے جل دیپ لاہری کے حوالے سے ایک رپورٹ چھاپی ہے۔ اس رپورٹ میں ایک بہت بڑا سبق چھپا ہوا ہے۔ یہ سبق کہ بعض ناخوشگوار باتیں صرف اس قابل ہوتی ہیں کہ ان کو برداشت کر لیا جائے۔ ایسی باتوں کو برداشت نہ کرنا صرف ان کی مقدار میں اضافہ کرنے کے ہم معنی ہے۔

یہ ۲۲ جون ۱۹۹۲ کی شام کا واقعہ ہے، راجدھانی اکسپرس دہلی سے ہوڑہ کے لیے روانہ ہوئی۔ ٹرین آگے بڑھی تو اس کی ایک کوچ (C-4) کے مسافروں کو محسوس ہوا کہ ان کی کوچ کا اے سی یونٹ کام نہیں کر رہا ہے۔ کوچ کے ۷۰ مسافر اس پر برہم ہو گئے۔ انھوں نے انجام پر زیادہ غور نہیں کیا۔ بس زنجیر کھینچ کر ٹرین کو روکا اور اس کو پیچھے چلنے پر مجبور کر دیا۔ ٹرین واپس ہو کر پہلے اسٹیشن (تلک برج) پر کھڑی ہو گئی۔

ٹرین کے مسافر پلیٹ فارم پر اتر آئے۔ ان میں اور ٹرین کے ذمہ داروں میں تکرار شروع ہو گئی۔ مسافروں کی مانگ یہ تھی کہ مذکورہ ناقص کوچ کو نکال دیا جائے اور اس کی جگہ صحیح کوچ لگائی جائے۔ دوسری طرف ریلوے کے ذمہ داروں کا کہنا تھا کہ اس وقت فوری طور پر ایسا کرنا ممکن نہیں۔ کیوں کہ قریب میں اس کا کوئی انتظام نہیں ہے۔

یہ بحث بے نتیجہ رہی۔ آخر کار ٹرین اپنی اسی ناقص کوچ کے ساتھ دوبارہ آگے کے لیے روانہ ہوئی۔ البتہ اس بحث و تکرار میں غیر ضروری طور پر راجدھانی اکسپرس پانچ گھنٹہ کے لیے لیٹ ہو گئی۔

مزید یہ کہ اس کی وجہ سے تلک برج اور نئی دہلی اسٹیشن کے درمیان "ریل جام" کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ اور پانچ آنے اور جانے والی ٹرینیں بھی کافی تاخیر سے روانہ ہو سکیں۔ راجدھانی اکسپریس کے دو مسافر جن کو وقت پر کلکتہ پہنچنا تھا، وہ اس صورت حال سے اتنا پریشان ہوئے کہ ٹرین کو چھوڑ کر پالم ایرپورٹ کی طرف بھاگے۔ تاکہ شام کا ہوائی جہاز پکڑ کر وقت پر اپنی منزل پر پہنچ سکیں۔

یہ معاملہ ذہن کی پختگی اور ناپختگی کا معاملہ ہے۔ ذہن کی ناپختگی نے سارا مسئلہ پیدا کیا۔ اگر مذکورہ کوچ کے مسافر پختہ ذہن کے لوگ ہوتے تو نہ یہ مسئلہ پیدا ہوتا اور نہ سیکڑوں مسافروں کو یہ غیر ضروری مصیبت اٹھانی پڑتی۔

ذہن کی پختگی کیا ہے۔ ذہن کی پختگی کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ آدمی ایسی حقیقت کو قبول کرلے جس کو وہ بدل نہیں سکتا، ناپختہ ذہن کے لوگ ایسی صورت حال پیش آنے پر چیخ اٹھتے ہیں، اور پختہ ذہن کے لوگوں کو ایسی صورت حال پیش آتی ہے تو وہ اس سے موافقت کر لیتے ہیں، تاکہ ان کا سفر حیات کسی رکاوٹ کے بغیر جاری رہے۔

مذکورہ ۷۰ مسافروں کے واقعہ پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہ ذہنی پختگی کے اس معیار پر پورے نہیں اترتے۔ اگر وہ لوگ ایسا کرتے کہ وقتی طور پر ایر کنڈیشنر کی محرومی پر صبر کرلیں تو ان کا مسئلہ صرف ایک مسئلہ رہتا۔ یعنی وقتی طور پر تھوڑی سی گرمی کو برداشت کر لینا۔ مگر جب انھوں نے صبر نہیں کیا تو ان کا مسئلہ مزید بڑھ کر کئی مسئلہ بن گیا۔

موجودہ دنیا میں سب کچھ کسی کی مرضی کے مطابق ہونا ممکن نہیں۔ یہاں زندگی نقصان پر راضی ہونے کا نام ہے۔ جو آدمی ایک نقصان پر راضی نہ ہو اس کو آخر کار کئی نقصان پر راضی ہونا پڑے گا۔

تخریبی منصوبہ

انڈیا کے سابق وزیر اعظم راجیو گاندھی کو مدراس میں ۲۱ مئی ۱۹۹۱ کو قتل کر دیا گیا تھا۔ قتل کرنے والے لنکا کے ٹمل ٹائگرس (LTTE) تھے۔ انھوں نے اس مقصد کے لیے اتنی کامیاب منصوبہ بندی کی تھی کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کبھی پکڑے نہ جا سکیں گے۔ مگر آخر کار ۲۰ اگست ۱۹۹۱ کو پولیس بنگلور کے ٹھیک اس مکان تک پہنچ گئی جہاں اس قتل کا اصل ذمہ دار (ماسٹر مائنڈ) ۲۳ سالہ سیوارسن (Sivarasan) چھپا ہوا تھا۔ پولیس کی بھاری جمعیت کو دیکھ کر سیوارسن اور اس کے ساتھیوں نے سائنائڈ کھا کر خودکشی کر لی۔

سیوارسن کے اس طرح پکڑے جانے کی وجہ اس کی ایک "غلطی" تھی۔ ۲۱ مئی کو جب سیوارسن اپنی ٹیم کے ساتھ اس جلسہ گاہ میں پہنچا جہاں اسے راجیو گاندھی کو قتل کرنا تھا تو اس نے اپنا حلیہ پریس رپورٹر جیسا بنایا تھا۔ اپنی اس تصویر کو مزید مکمل کرنے کے لیے اس نے ایک مقامی فوٹوگرافر ہری بابو کو ساتھ لے لیا۔

ہری بابو صرف ایک کرایہ کا آدمی تھا۔ مصلحت کی بنا پر اس کو اصل منصوبہ سے بے خبر رکھا گیا تھا۔ ہری بابو نے حسب معمول مختلف رخ سے راجیو گاندھی کی تصویریں لیں۔ انھیں میں ایک تصویر ایسی تھی جس میں سیوارسن کی تصویر بھی آگئی۔ جب وہ بم پھٹا جس نے راجیو گاندھی کو ہلاک کیا تھا تو اس کے بعد قریب کے جو لوگ مرے ان میں سے ایک مذکورہ ہری بابو بھی تھا۔ سیوارسن بچ کر بھاگ جانے میں کامیاب ہو گیا مگر اس کے "فوٹوگرافر" کا کیمرہ پولیس کے قبضہ میں آگیا۔ پولیس نے اس کیمرہ کے اندر سے سیوارسن کا فوٹو حاصل کر کے اسے اخباروں میں چھاپ دیا اور اعلان کیا کہ جو شخص اس فوٹو والے کا پتہ دے گا اس کو دس لاکھ روپیہ انعام دیا جائے گا۔ بنگلور کی ایک دودھ والی عورت جو سیوارسن کو روزانہ دودھ پہنچاتی تھی، اس نے فوٹو کی مدد سے سیوارسن کو پہچان لیا۔ اس کی سراغ رسانی پر پولیس بنگلور کے مضافات میں مذکورہ مکان پر پہنچ گئی (ٹائمس آف انڈیا ۲۱ اگست ۱۹۹۱)

ایک تخریبی واقعہ کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے بے شمار عوامل کی مساعدت درکار ہوتی ہے۔ انسان اپنی محدودیت کی بنا پر ان کی رعایت نہیں کر پاتا۔ کوئی نہ کوئی رخنہ ہر تخریبی منصوبہ میں رہ جاتا ہے۔ یہی رخنہ تخریب کار کے منصوبہ کو ناکام بنا دیتا ہے۔

دار الصحوہ نے کثیر تعداد میں عربی کتابیں چھاپی ہیں۔ وہ قاہرہ کے بڑے نشریاتی اداروں میں سے ہے۔ اس کے تعارف نامہ میں لکھا ہوا ہے کہ دار الصحوہ صرف تجارتی دار الاشاعت کے طور پر قائم نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ اس کے سامنے ایک اسلامی نشانہ ہے۔ اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے اندر حقیقی دینی فہم پیدا کرے اور ان کو جدید چیلنج کا مقابلہ کرنے کے قابل بنائے۔

دار الصحوہ کا مقصد، اس کے تعارف نامہ کے مطابق، یہ ہے کہ اہل اسلام کو روحانی اور ثقافتی اعتبار سے بلند کرے۔ ان کے اندر اعلیٰ ترین فکری اور اخلاقی اوصاف پیدا کرے تاکہ وہ سنت اللہ کے مطابق عالمی قیادت کے مستحق بن سکیں۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ عالمی قیادت کا منصب انھیں کو دیتا ہے جو فکری اور اخلاقی اور ثقافتی اعتبار سے بلند درجہ کو پہنچے ہوئے ہوں۔ دار الصحوہ کے انچارج جناب محمد کمال صاحب نے اپنے مکتبہ کی کئی کتابیں مجھے دیں۔ ان میں سے ایک شیخ شعراوی کی کتاب تھی۔

شیخ محمد متولی الشعراوی یہاں کے مشہور عالم ہیں۔ وہ زیادہ تر تقریریں کرتے ہیں۔ ان کی کچھ باتوں کا مجموعہ چھاپا گیا ہے۔ اس کو مرتب کرنے والے ابو الحسن عبد الرزاق ہیں۔ اس میں بہت سی نصیحت کی باتیں ہیں۔ ایک اقتباس میں انھوں نے کہا کہ ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور اپنے معاشرہ کو مجتمع اسلامی کہتے ہیں۔ مگر ہم اسلامی مجتمع نہیں۔ در اصل ہم اسلامی جغرافیہ ہیں (نحن فی الواقع لسنا مجتمعاً اسلامیا، نحن جغرافیة اسلامیة) صفحہ ۴۰

شیخ شعراوی کی یہ کتاب تمام تر خطابی انداز میں ہے۔ اس میں کسی بات کا گہرا تجزیہ مجھے نہیں ملا۔ مثال کے طور پر کتاب کے صفحہ ۳۰ پر ایک حدیث کو عنصراً نقل کیا گیا ہے۔ اس حدیث کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرب قیامت کی علامتوں میں سے ایک علامت یہ ہے کہ ہر قبیلہ کے منافق اس کی سرداری کریں گے (من علامات الساعة ... ویسود کل قبیلة منافقوها) اس حدیث پر انھوں نے خطابی انداز کے کچھ جملے کہے ہیں مگر وہ اس کی کوئی گہری تشریح نہ کر سکے۔

اس حدیث کا پورا مطلب اس وقت سمجھ میں آتا ہے جب کہ اس کو قرآن سے ملا کر دیکھا جائے۔ قرآن میں منافقین کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ جب تم انھیں دیکھو تو ان کے جسم تم کو اچھے لگتے ہیں، اور اگر وہ بات کریں تو تم ان کی بات کو سنتے ہو (المنافقون ۴)

منافق حقیقۃً اس انسان کا نام ہے جو مصلحت پرست اور زمانہ ساز ہو۔ اس کی اس صفت کی بنا پر اس کے دنیوی معاملات درست رہتے ہیں۔ اس کی زندگی خوش حالی کی زندگی ہوتی ہے۔ اس کی زندگی غم سے خالی ہوتی ہے۔ اس کے ان حالات کا اثر اس کے جسم پر پڑتا ہے۔ اس کا جسم پرکشش جسم بن جاتا ہے۔ اسی طرح اپنے مخصوص مزاج کی بنا پر وہ اس بحث میں نہیں پڑتا کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا۔ اصول کیا ہے اور بے اصولی کیا۔ تضاد والا کلام کیا ہے اور بے تضاد کلام کیا۔ اس کے بجائے وہ موقع کی رعایت کرکے بولتا ہے۔ اس بنا پر اس کا کلام ہر ایک کی پسند کا کلام بن جاتا ہے۔

منافقین کی یہ خصوصیت ہر دور میں ان کو عوام کا لیڈر بنائے رہی ہے۔ قرب قیامت میں پریس اور اسٹیج کا دور آجانے کی وجہ سے منافقین کے یہ مواقع اور زیادہ بڑھ جائیں گے۔ اپنی مذکورہ صفات کے اظہار کے لئے وہ زیادہ وسیع مواقع پالیں گے اور نتیجۃً زیادہ بڑے پیمانے پر اپنے لئے قیادت کا مقام حاصل کرلیں گے۔

ایک مصری عالم نے گفت گو کے دوران کہا کہ یورپی اور امریکی ہی موجودہ زمانہ کے صلیبی ہیں (الصلیبیون الآن هم الاوربیون والامریکیون) انھوں نے شیخ محمد ابوزہرۃ کا قول دہرایا: ان کل حرب تقع بین اقلیم اسلامی ودولة اوروبیة هی حرب صلیبیة (ہر جنگ جو کسی مسلم ملک اور کسی مغربی ملک کے درمیان ہوتی ہے وہ صلیبی جنگ ہے)

آج تقریباً پوری عرب دنیا کی سوچ یہی ہے۔ مگر میرے نزدیک یہ سوچ صحیح نہیں۔ یہی وہ خاص سوچ ہے جس نے مسلم دنیا کی نظر میں مغربی قوموں کو نفرت کا موضوع بنا دیا ہے۔ حالاں کہ امت مسلمہ کی داعیانہ حیثیت کا تقاضا ہے کہ مغربی قومیں اس کے لئے شفقت و ہمدردی کا موضوع بنیں۔

ایک مجلس میں چند عرب لوگ تھے۔ ایک صاحب نے کہا کہ آپ جو مشن چلا رہے ہیں، اس سے مجھے اتفاق ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ آپ کے بعد یہ مشن کس طرح جاری رہے گا۔ کیا آپ نے اپنے بعد کے لئے اپنے جیسا کوئی شخص تیار کیا ہے جو آپ کی جگہ لے سکے۔ اس پر رابطہ عالم اسلامی کے شیخ ادریس نے کہا: وحید الدین لایکون الا وحیداً (وحید الدین صرف ایک ہی ہوتا ہے)

یہ کسی ایک شخص کی بات نہیں بلکہ ہر آدمی کی بات ہے۔ ہر آدمی جو اس دنیا میں آتا ہے وہ ایک

منفرد شخصیت لے کر آتا ہے۔ جس طرح ہر آدمی کے انگوٹھے کا نشان دوسروں سے الگ ہوتا ہے، اسی طرح ہر آدمی کی شخصیت بھی دوسروں سے الگ ہوتی ہے۔ کسی بھی آدمی کی تکرار اس دنیا میں ممکن نہیں۔

۱۲ اکتوبر کی سہ پہر کو ہم اہرام وغیرہ دیکھنے کے لئے نکلے۔ ایک مقام پر پہنچے تو ایک اونچی بلڈنگ کے اوپر آخری منزل پر ایک سفید اور کالا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس عمارت کے اوپر کے حصہ میں اسرائیل کا سفارت خانہ واقع ہے۔ پہلے یہ سفارت خانہ نیچے کی منزل پر تھا۔ مگر اس پر حملے ہوئے۔ اس کے بعد اس کو اوپر کی آخری منزل پر قائم کر دیا گیا۔ تاہم قاہرہ میں وہ یہاں کے سماج سے بالکل کٹ کر رہتے ہیں۔ یہاں کوئی ان سے ملنا پسند نہیں کرتا۔

پہلا اسرائیلی سفیر جب اپنی مدت پوری کر کے قاہرہ سے اسرائیل واپس گیا تو اس کی بیوی نے اسرائیلی اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قاہرہ میں ہم کسی جیل کے اندر تھے۔ اب اس سے نکل کر آزاد دنیا میں آئے ہیں۔

قاہرہ کی مذکورہ بلڈنگ کے اوپر اسرائیل کا جھنڈا لہراتے ہوئے دیکھ کر خیال آیا کہ جس ملک میں تورہ کے بعد اس کے اول حکمراں نے اسرائیل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ سنرصیکم فی البحر (ہم تم کو سمندر میں پھینک دیں گے) عین اسی ملک میں اس حکمراں کے پہلے جانشین کے زمانہ میں خود اس کی اجازت سے یہ واقعہ پیش آیا کہ اسرائیل نے دار السلطنت قاہرہ میں داخل ہو کر وہاں اپنا جھنڈا نصب کر دیا۔

حقیقتیں کبھی الفاظ سے نہیں بدلتیں بلکہ اس کے مطابق ضروری اسباب فراہم کرنے سے بدلتی ہیں۔ موجودہ زمانہ کے بیشتر قائدین کا یہ حال ہے کہ انھوں نے پرجوش الفاظ بولنے کو حقیقی عمل کا بدل سمجھ لیا ہے۔ مگر اس قسم کی خوش فہمی صرف خوش فہم آدمی کے ذہن میں جگہ پاتی ہے وہ زمین پر کبھی قائم نہیں ہوتی۔

جامعۃ القاہرہ، حدیقۃ الحیوانات اور دوسرے مقامات کو دیکھتے ہوئے ہمارا سفر طے ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ہم جیزہ کے اہرام تک پہنچ گئے۔ یہاں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر تین اہرام واقع ہیں۔ کھلے میدان میں پتھر کے بڑے بڑے ٹکڑوں سے بنے ہوئے اہرام اس طرح کھڑے ہوئے تھے جیسے مصر کی گزری ہوئی تاریخ اپنی تمام قدامت کے ساتھ اٹھ کر کھڑی ہو گئی ہو اور خاموش زبان

میں اپنا تعارف کرا رہی ہو۔

ہماری گاڑی اہرام کی طرف آگے بڑھی تو ایک سپاہی نے اس کو روک لیا۔ وہ ہمارے ساتھی سے بات کر رہا تھا جو گاڑی چلا رہے تھے۔ میں حسب عادت پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی نظر میرے اوپر پڑی تو اس کا رویہ بدل گیا۔ اس نے یہ کہہ کر گاڑی آگے کی طرف جانے کی اجازت دے دی کہ: من اجل الشیخ الکبیر سمحنا لك۔ میں نے سوچا کہ اس دنیا میں اگر طاقت ور آدمی کی طاقت میں تاثیر ہے تو میرے جیسے ضعیف آدمی کا ضعف بھی اپنے اندر ایک طاقت رکھتا ہے۔ اور بعض اوقات ضعیف کی طاقت قوی کی طاقت سے زیادہ موثر ہوتی ہے۔

تین اہرام دیکھنے کے بعد میں نے ابوالہول کو دیکھا جو اہرام سے الگ پتھر کو تراش کر بنایا گیا ہے۔ ایک سیاح عالمی سفر کر کے واپس آیا۔ لوگوں نے اس سے پوچھا کہ تم نے ساری دنیا کا سفر کیا ہے۔ بتاؤ کہ سب سے عجیب چیز تم نے کیا دیکھی۔ اس نے کہا: ابوالہول کے اعضاء کا تناسب۔ ابوالہول نامی بت

بہت بڑا ہونے کے باوجود متناسب الاعضاء ہے۔ تاہم مجھ کو وہ اتنا زیادہ متناسب نظر نہیں آیا جتنا مذکورہ سیاح نے بتایا ہے۔

اہرام دیکھنے کے دوران ایک موقع پر تمام سواریاں روک دی گئیں۔ اتنے میں ایک درجن کاروں کا قافلہ خاص آداب کے ساتھ آیا۔ معلوم ہوا کہ وزیر اعظم مالٹا اہرام دیکھنے کے لئے آئے ہیں۔ یہی دھوم پچھلے دن قاہرہ کے ہوائی اڈہ پر نظر آئی تھی جب کہ مالٹا کے وزیر اعظم قاہرہ ایئرپورٹ پر اترے تھے۔ مالٹا میں ہم نے دیکھا تھا کہ وزیر اعظم وہاں عام انسانوں کی طرح رہتا ہے۔ مگر قاہرہ آتے ہی اس کے ساتھ شاہانہ آداب کا منظر دکھائی دینے لگا۔ کتنا فرق ہے ایک ملک اور دوسرے ملک میں۔

ایک انگریزی اخبار میں ایک دلچسپ مضمون پڑھا۔ اس کے ساتھ ایک تصویر بھی شامل تھی۔ اس تصویر میں مصر کے تین اہرام نظر آرہے تھے۔ دوسری طرف اونٹ اپنی روایتی صورت میں موجود تھے۔ اسی کے ساتھ اہرام کے سامنے کھلے ہوئے میدان میں ایک چاند گاڑی تھی۔ اس کے اوپر ایک آدمی خلائی لباس (اسپیس سوٹ) پہنے ہوئے دکھائی دے رہا تھا۔ تصویر کے اوپر لکھا ہوا تھا: کیا خلائی تحقیق کرنے والے قدیم مصر میں اترے تھے۔

یہ ایک فرضی قیاس آرائی تھی۔ مگر آرٹسٹ کے قلم نے کاغذ کے اوپر اس کو ایک واقعہ کی صورت میں ڈھال دیا۔ اگر آپ صرف کاغذی نقشہ کو دیکھیں تو وہ آپ کو واقعہ معلوم ہوگا۔ اور اگر آپ اپنے ذہن کو استعمال کریں تو آپ پر کھلے گا کہ وہ صرف ایک لطیفہ ہے۔ اس دنیا میں اگر کوئی شخص صرف ظاہر کی بنیاد پر رائے قائم کرے تو وہ کبھی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہاں حقیقت کو صرف وہ شخص پاتا ہے جو ظاہر سے گزر کر باطن تک پہنچنے کی کوشش کرے۔

استاذ محمد کمال نے نہر سوئز جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ صبح کو قاہرہ سے بذریعہ کار سوئز جانا اور پھر شام تک وہاں سے واپس آنا تھا۔ مجھے خود بھی سوئز دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ مگر بعض دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے میں سوئز کا سفر نہ کر سکا۔

سوئز کی تاریخ کے ساتھ طرح طرح کے خوشگوار اور ناخوشگوار واقعات شامل ہیں۔ سوئز وہ مصنوعی نہر ہے جو میڈیٹرینین اور ریڈ سی کو ملاتی ہے اور اس طرح یورپ اور مشرقی دنیا کے درمیان بحری سفر کو مختصر کر دیتی ہے۔ اس نہر کا تخیل کافی قدیم ہے۔ ۱۸۵۶ میں سوئز کینال کمپنی بنی۔ ۱۸۵۹

میں کھدائی کا کام شروع کیا جو آخری طور پر ۱۸۶۹ میں مکمل ہوا۔ نومبر ۱۹۶۹ میں وہ جہاز رانی کے لئے کھول گئی۔

مختلف حالات سے گزرتے ہوئے یہ کمپنی فرانس اور برطانیہ کی ملکیت میں آگئی۔ ابتدائی ٹھیکہ کے مطابق، سوئز پر کمپنی کا کنٹرول ۹۹ سال تک رہنا تھا جو ۱۹۶۸ میں ختم ہوتا تھا۔ آخری زمانہ میں سوئز کے کل منافع میں مصر کا حصہ سات فیصد تھا۔ کمپنی کے کارکنوں میں زیادہ تعداد مصریوں کی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ کمپنی کی ذمہ داری یہ بھی تھی کہ وہ علاقہ میں اسپتال، اسکول وغیرہ قائم کرے۔ حوالہ کے لئے: انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، جلد ۱۷، صفحہ ۷۶۸

مصر میں جمال عبدالناصر کی حکومت آئی تو انھوں نے اسوان ڈیم کا منصوبہ بنایا۔ امریکہ نے اس کے لئے ۲۷ کروڑ ڈالر (\$270,000,000) کی اقتصادی مدد منظور کی۔ برطانیہ نے بھی مدد کا وعدہ کیا۔ مگر جمال عبدالناصر نے اسی کے ساتھ اندر اندر کمیونسٹ بلاک سے تعلقات قائم کر لئے۔ انھوں نے چیکو سلاویکیا سے ہتھیار حاصل کرنے کا خفیہ معاملہ کیا۔ اس پر امریکہ بگڑ گیا۔ اس نے ڈیم کی امداد روک دی۔ اس کے بعد ۲۹ اکتوبر ۱۹۵۶ کو جمال عبدالناصر نے تالیوں کی گونج کے درمیان اعلان کیا کہ آج ہم نے نہر سوئز کو نیشنلائز کر لیا اور اب ہم اس کی آمدنی سے اسوان ڈیم کی تعمیر کریں گے۔ (12/844)

جمال عبدالناصر کے اس اقدام نے مغربی قوموں کو ان کا دشمن بنا دیا۔ اس کے فوراً بعد فرانس اور برطانیہ نے اسرائیل کے ذریعہ مصر پر حملہ کرا دیا۔ خود بھی پوری طرح اس کی مدد کی۔ اس حملہ میں مصر کی فوجی طاقت کچل کر رہ گئی۔ اسرائیل نے مزید اطراف کے علاقوں پر قبضہ کر کے اپنے رقبہ کو پانچ گنا بڑھا لیا۔

جمال عبدالناصر اگر ۱۲ سال انتظار کرتے تو سوئز کمپنی معاہدہ کے مطابق اپنے آپ ختم ہو جاتی۔ مگر ان کے عاجلانہ اقدام نے مصر کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ جو چیز ۱۹۶۸ میں اپنے آپ مل جاتی، اس کو ۱۹۵۶ میں پیشگی طور پر حاصل کرنے کی کوشش مصر کے حق میں الٹی ثابت ہوئی۔

ایک ہندستانی مصنف کی عربی کتاب قاہرہ سے چھپی ہے۔ اس کا نام ہے: المسلمون فی الهند، بين خدعة الديمقراطية واكذوبة العلمانية۔ میں نے پڑھنے کے لئے لیا تو اس کا پہلا جملہ یہ تھا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے انڈیا کے ہندوؤں نے طے کر لیا ہے کہ وہ اسپین کے

قصہ کو انڈیا کے مسلمانوں کے ساتھ دہرائیں (یبدو ان الهندوس فی الهند قرروا ان یقوموا بتکریر قصة الاندلس)

پوری کتاب انشائی انداز میں ہے۔ حقائق سے صرف نظر کرکے اس میں الفاظ کا جوش وخروش دکھایا گیا ہے۔ آخر میں ہندستانی مسلمانوں کے لئے افغانی جنگجوؤں کو بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے: وان شعبنا الهندی المسلم الذی یزید عدده عن عدد المجاهدین الافغان سبعة اضعاف یستطیع ان یستفید من الدرس الافغانی ویستوعبه (صفحہ ۹۷)

یہ سب باتیں اتنی بے معنی ہیں کہ مجھے ان لوگوں کی عقل پر حیرت ہوتی ہے جو اس کو لکھیں اور ان لوگوں کی عقل پر بھی حیرت ہوتی ہے جو اس کو چھاپ کر پھیلائیں۔

ایک مصری مصنف (عبد الجید صبح) کی کتاب دیکھی۔ ۲۷۰ صفحہ کی اس کتاب کا نام حقائق الاسلام بین الجهاد والجمود تھا۔ اس کتاب کے ٹائٹل پر دو تلواریں بنی ہوئی تھیں۔ ایک تلوار مسلم ملت کو سیاسی حیثیت سے قتل کر رہی تھی اور دوسری تلوار اس کو دینی حیثیت سے۔

پوری کتاب جدلی انداز میں ہے۔ مگر اس کے تعارف میں ٹائٹل کے آخری صفحہ پر بتایا گیا ہے کہ وہ منہج علمی پر لکھی گئی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے مصنفینِ اسلام منہج علمی کو جانتے بھی نہیں۔ کجا کہ وہ منہج علمی پر کتاب لکھ سکیں۔

عربوں کی موجودہ نفسیات کی بنا پر جہاد کی باتیں ان کو بہت پسند آتی ہیں۔ کتابوں کے جارحانہ ٹائٹل اور ٹائٹل کے اوپر عسکری آرٹ ان کے درمیان بہت پسند کیا جاتا ہے۔ قاہرہ میں ہم کتابوں کی ایک دکان میں داخل ہوئے۔ معمولی مشاہدہ میں دس سے زیادہ ایسی کتابیں نظر آئیں جن کے ٹائٹل پیج پر تلوار کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ مثلاً —— مقام الصحابة، حقائق الاسلام، خفقات قلب، شهداء الصحابة، الدولة والسلطة فی الاسلام، السبحة اوالدماں الفارس المصلوب عبد الله بن الزبیر، شهید المحراب عمر بن الخطاب، الاعلام الخلیجی، صور وبطولات، وغیرہ۔

الشیخ محمد متولی الشعراوی مصر کے بڑے عالموں میں سے ہیں۔ وہ لوگوں میں بہت مقبول تھے۔

انور السادات کے زمانہ حکومت میں سبعینات میں انھوں نے وزیر اوقاف کا عہدہ قبول کرلیا۔ اس کے بعد عوام کے درمیان ان کی مقبولیت بہت کم ہوگئی۔ وہ "سرکاری مولوی" سمجھے جانے لگے۔ شیخ شعراوی نے اس فرق کو محسوس کیا اور ۱۹۷۹ میں وزارت سے الگ ہوگئے۔ اس کے بعد انھوں نے کبھی حکومت میں کوئی عہدہ قبول نہیں کیا۔ آج وہ مصر کے مقبول ترین عالم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ صورت حال موجودہ زمانہ میں اسلام کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ کچھ ناعاقبت اندیش قائدین نے یہ روایت قائم کی ہے کہ اسلام کا سب سے بڑا کام حکومت کا مخالف بن کر کھڑا ہونا ہے۔ اسلام کے نام پر جاری کی جانے والی اس غیر اسلامی سیاست نے اسلام کو جتنا نقصان پہنچایا ہے اتنا کسی دشمن نے بھی اسلام کو نقصان نہیں پہنچایا۔ موجودہ زمانہ میں تمام اعلیٰ ذرائع حکومت کے قبضہ میں ہوتے ہیں۔ ان ذرائع کو استعمال کرکے اسلام کی عظیم خدمت کی جاسکتی ہے۔ مگر غلط طور پر یہ صورت حال بن گئی ہے کہ جو شخص حکومت کے قریب ہو وہ مسلم عوام سے دور ہو جاتا ہے اور جو شخص مسلم عوام سے قریب ہونا چاہے اس کو حکومت سے دور ہونا پڑتا ہے۔

رجاء بن حیوہ نے سلطان وقت سے قریب ہوکر عمر بن عبد العزیز جیسے انسان کے لئے خلافت کا راستہ کھولا۔ مگر آج کوئی عالم رجاء بن حیوہ بننے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ سعودی عرب میں شیخ ابن باز، مصر میں شیخ طنطاوی اور شام میں شیخ کفتارو حکومت سے مل کر دین کا کام کرنا چاہتے ہیں۔ مگر وہ عوام میں غیر مقبول ہیں۔ دوسری طرف جو علماء حکومت سے لفظی یا عملی ٹکر لے رہے ہیں، انھوں نے کوئی بھی حقیقی فائدہ نہیں پہنچایا، مگر عوام میں انھیں کو مقبولیت حاصل ہے۔

قاہرہ کے زمانہ قیام میں محمد الخطیب کی کتاب بالاسلام مصر دولۃ عظمی دیکھی۔ پوری کتاب خطیبانہ انداز میں ہے۔ ۳۳۳ صفحہ کی اس کتاب کو پڑھنے کے بعد قاری کے اندر فکری ہیجان کے سوا اور کچھ پیدا نہیں ہوسکتا۔ جبکہ صحیح کتاب وہ ہے جو آدمی کے اندر سنجیدہ تعمیری ذہن پیدا کرے۔

کتاب کا خلاصہ موجودہ مسلمانوں کو ابھار کر ان کے اندر وہ چیز پیدا کرنا ہے جس کو مصنف نے الشخصیۃ الجہادیۃ للفرد والامۃ علی السواء (صفحہ ۱۳۳) کہا ہے۔ کتاب میں بار بار دہرایا گیا ہے کہ مسلمان عظیم تاریخ کے وارث ہیں۔ وہ امامت عالم اور قیادت بشری کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔

ان کا مشن یہ ہے کہ اپنے عقیدہ کی بنیاد پر عالمی حکومت قائم کریں۔ اور پھر خاتمہ میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ عنقریب وہ عظیم اسلامی حکومت قائم ہو کر رہے گی، خواہ شر کی طاقتیں چاہیں یا نہ چاہیں (ستقوم الخلافة الاسلامية لامحالة باذن الله شاءت قوى الشر ام ابت)

کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کے نزدیک شاید اذن اللہ کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے ہمارے لئے ایسا ہونا مقدر کر دیا ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ اذن اللہ کا تعلق اصول سے ہے نہ کہ کسی گروہ سے۔ اس سے مراد قانون فطرت ہے نہ کہ مسلم قوم۔

کتاب میں زور و شور کے ساتھ جاپان کی مثال دہرائی گئی ہے کہ وہ دوسری عالمی جنگ میں خاکستر ہو گیا اور پھر اٹھ کر وہ عالمی طاقت بن گیا۔ جب کہ مصر کے پاس امکانیات کی مقدار اس سے بہت زیادہ ہے۔ یہ حوالہ صحیح نہیں۔ کیوں کہ اہل جاپان نے اس طرح ترقی نہیں کی کہ ان کے یہاں خطیبوں اور انشاپردازوں کا ایک گروہ اٹھا اور اس نے عظمت ماضی کے اعادہ کے نام پر پرجوش الفاظ کا دریا بہانا شروع کر دیا۔ اس کے برعکس جاپان کے اہل فکر نے اپنی قوم کے اندر اعتراف حقیقت کا مزاج پیدا کیا۔ انھیں اس پر راضی کیا کہ وہ امریکی اقتدار اور اس کے منصوبوں کو بلا بحث تسلیم کر لیں۔ وہ اس سے ٹکرائے بغیر اس کے حدود میں رہ کر خالص غیر سیاسی انداز میں اپنی پر مشقت تعمیر کریں۔

قرآن میں ہے کہ وجعلنا منهم ائمة يهدون بامرنا لما صبروا (السجدہ ۲۴) گویا اذن اللہ یہ ہے کہ اس دنیا میں صبر کرنے والے کو امامت کا منصب دیا جاتا ہے۔ مسلمان صبر کو حذف کر کے قیادت کے منصب پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور خدا کی دنیا میں کبھی ایسا ہونے والا نہیں۔

قاہرہ سے ایک عربی روزنامہ الشعب نکلتا ہے۔ اس کے شمارہ ۱۵ ربیع الاول ۱۴۱۲ھ میں ڈکٹور محجوب عمر کے قلم سے ایک مضمون تھا۔ اس کا عنوان تھا: المشكلة هي اسرائيل۔ یہی اس وقت عالم اسلام کے اہل فکر کا عام مزاج ہے۔ وہ اسرائیلی اور غیر اسرائیلی سازشوں کو مسلمانوں کا اصل مسئلہ سمجھتے ہیں۔ مگر اس قسم کا طرز فکر قرآن کی تردید کے ہم معنی ہے۔ قرآن کے مطابق، مسلمانوں کی اصل مشکل یا ان کا اصل مسئلہ ان کی داخلی کمیاں ہیں نہ کہ خارجی دشمن کی سازشیں۔ لیکن مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے اپنے بے فائدہ کلام سے مسلمانوں کو اس فرضی وہم سے نکلنے نہیں دیتے۔

ایک بار میں قاہرہ کی ایک سڑک سے گزر رہا تھا۔ سڑک کے کنارے ایک طرف وسیع میدان اور اونچا پنڈال نظر آیا۔ ہمارے مصری رفیق محمد کمال صاحب نے بتایا کہ یہی وہ میدان ہے جہاں ۶ اکتوبر ۱۹۸۱ کو عرب۔ اسرائیلی جنگ (اکتوبر ۱۹۷۳) کی یاد میں ملٹری پریڈ ہو رہی تھی اور سابق مصری صدر انور السادات اپنے رفقاء کے ساتھ پنڈال پر بیٹھے ہوئے تھے۔ عین اس وقت فوج کا ایک جوان اپنی صف سے نکلا اور تیزی سے گولی مار کر انھیں ہلاک کر دیا۔

انور السادات کا قاتل ایک مصری نوجوان خالد اسلامبولی تھا۔ وہ الاخوان المسلمون کی تحریک سے متاثر ہوا۔ وہ انور السادات کے سخت خلاف تھا۔ مقدمۂ قتل کے دوران جج نے اس سے کہا کہ تمہارے اوپر انور السادات کے قتل کا الزام ہے۔ اس نے کہا کہ ہاں۔ میں نے ہی اس فرعون کو قتل کیا ہے۔ عدالتی فیصلہ کے تحت ۸ مارچ ۱۹۸۲ کو خالد اسلامبولی کو قتل کر دیا گیا۔

خالد اسلامبولی کی ماں سے ایک عربی جریدہ نے انٹرویو لیا تھا۔ اس انٹرویو میں خالد اسلامبولی کی ماں نے بڑے ہی جذباتی انداز میں ایک ایک سوال کا جواب دیا تھا۔ اس انٹرویو کا ایک جزء یہ ہے :

(ام خالد نے کہا) خالد سے جب پہلی بار سجن حربی میں میری ملاقات ہوئی تو اس وقت اس کے خلاف قتل کا کیس شروع ہو چکا تھا اور اس دن مقدمۂ قتل کی سماعت کا دوسرا دن تھا۔ ہال میں داخل ہو کر میں تیزی سے چلتی ہوئی خالد کے پاس پہنچ گئی۔ خالد اس وقت عدالت کے مخصوص کٹہرے میں کھڑا ہوا تھا۔ وہ بالکل مطمئن تھا۔ اس نے میری پریشانی کو محسوس کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ قول دہرایا جو آپ نے کہ میں یاسر کے خاندان کو عذاب میں مبتلا دیکھ کر فرمایا تھا : صبراً آلَ یاسر موعدکم الجنۃ (آل یاسر صبر کرو کیوں کہ تمہارے لیے جنت کا وعدہ ہے) یہ حسن اتفاق کی بات ہے کہ خالد کی کنیت بھی ابو یاسر تھی۔

خالد اسلامبولی کی جرأت اور بے خوفی بلاشبہ ایک واقعہ ہے۔ مگر آل یاسر کی مثال ان کے اوپر چسپاں نہیں ہوتی۔ کیوں کہ آل یاسر کا معاملہ یک طرفہ تھا اور خالد اسلامبولی کا معاملہ دو طرفہ۔ آل یاسر نے ظلم کو برداشت کیا، اس کے باوجود ان پر سزا ڈھائی گئی۔ جب کہ خالد اسلامبولی کا معاملہ یہ ہے کہ انھوں نے ظلم کو برداشت نہیں کیا، اسی لیے انھیں سزا دی گئی۔

۱۲ اکتوبر کو ۱۰ بجے ہم قاہرہ کے تاریخی مقامات دیکھنے کے لئے نکلے۔ ہم سڑک سے گزر رہے تھے اور ہمارے رفیق محمد کمال صاحب ہر چیز کا تعارف کراتے جا رہے تھے۔ ایک جگہ نظر آیا کہ سڑک کے کنارے اونچی فصیلوں سے گھری ہوئی عمارت ہے۔ فصیل کے اوپر جگہ جگہ سپاہی بندوق لئے ہوئے کھڑے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ یہاں کا سنٹرل جیل ہے۔ میرے رفیق نے کہا کہ یہ جیل ہے۔ اخوان کے لوگوں کو اسی کے اندر سخت سزائیں دی گئی تھیں (ھٰذا سجن۔ عُذِّب فیہ الاخوان المسلمون)

سڑک کے دوسری طرف دریائے نیل بہہ رہا تھا۔ میں نے اس کو بہت غور سے دیکھا۔ نیل کے متعلق مضامین اور کتابوں میں جو کچھ پڑھا تھا، اس سے ذہن میں نیل کے بارہ میں ایک عجیب افسانوی تصور تھا۔ مگر نیل ویسا ہی ایک بڑا دریا نظر آیا جیسے دوسرے بڑے دریا ہوتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سن کر یا پڑھ کر آدمی کے ذہن میں کسی چیز کے بارہ میں ایسا تاثر قائم ہو جاتا ہے جو واقعہ کے مطابق نہیں ہوتا۔ کبھی اصل واقعہ سے کم اور کبھی اصل واقعہ سے زیادہ۔

سڑک کے دونوں طرف اونچی بلڈنگیں اسی طرح دکھائی دے رہی تھیں جس طرح ماسکو میں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ جمال عبد الناصر کی دین ہے۔ ناصر نے مصر کی ترقی کے لئے سوشلسٹ نمونہ اختیار کیا۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ جن لیڈروں نے سوشلسٹ نمونہ کو اختیار کیا انھوں نے صرف ملک کو برباد کیا۔ اس کے برعکس جن لوگوں نے امریکی نمونہ کو اختیار کیا، وہ کم از کم دنیوی اعتبار سے اپنے ملک کو ترقی دینے میں کامیاب ہو گئے۔

مسجد صلاح الدین کو ہم نے باہر سے دیکھا۔ اس کو دیکھ کر اسلامی تاریخ کی اس مشہور شخصیت کی یاد تازہ ہو گئی جس نے اپنی ذات سے ایک نئی تاریخ بنائی۔ چلتے ہوئے ہم مسجد عمرو بن العاص پہنچے۔ یہ عمرو بن العاص صحابی نے ۲۱ھ میں تعمیر کرائی تھی۔ ابتدائی مسجد کھجور کے تنوں پر بنائی گئی تھی۔ اس کے بعد مختلف سلاطین کے زمانہ میں اس میں ترمیم اور اضافہ ہوتا رہا۔ تاہم مسجد کی شکل بنیادی طور پر وہی ہے جو ابتدا میں تھی۔ کھجور کے تنوں کا قائم مقام آج پتھر کے بنے ہوئے گول ستون ہیں۔ اس مسجد کا طرز عام مساجد سے بالکل مختلف ہے۔ اس کے اندر چلتے ہوئے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ہم تاریخ کے درمیان سفر کر رہے ہیں۔ چودہ سو سالہ تاریخ کے دونوں سرے ایک لمحہ کے لئے ملتے ہوئے نظر آئے۔ مسجد کے باہر ایک کتبہ لگا ہوا ہے اس کی ابتدائی دو سطریں یہ ہیں:

جامع عمرو بن العاص ۲۱ ھ - ۶۴۲ م : اول المساجد التی أنشأت فی مصر وافریقیا واول جامعة علمیة فی مصر أسسها عمرو ابن العاص۔

ظہر کی نماز ہم نے اسی مسجد میں پڑھی۔ مسجد کے اندرونی حصہ میں وضو خانہ نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ وضو خانہ باہر بنا ہوا ہے۔ ہم عقبی دروازہ سے باہر نکلے۔ مسجد سے متصل ایک لمبی اور وسیع پٹی کے دوسری طرف وضو خانہ کی عمارت تھی۔ مسجد اور وضو خانہ کے درمیان خالی زمین جو یقیناً مسجد ہی کی زمین تھی وہ کوڑا خانہ کا منظر پیش کر رہی تھی۔

اس کے بعد ہم المتحف المصری (مصری میوزیم) پہنچے۔ اس کے گیٹ پر پہنچے تو میرے مصری ساتھی نے کہا : لم ادخل هذا المتحف من قبل۔ اول مرة ادخل۔ عام طور پر میں نے دیکھا ہے کہ اس طرح کی چیزوں سے مقامی لوگوں کو کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی۔ باہر کے لوگ افسانوی شوق لے کر اس کو دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔ مگر مقامی لوگ کم ہی اس کو دیکھنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اسی متحف میں اس فرعون کی مومیائی کی ہوئی لاش ہے جو موسیٰ علیہ السلام کا ہم زمانہ تھا۔ اس کو تاریخ میں ریمسس ثانی (Ramses II) کہا جاتا ہے۔

قاہرہ کا جامعۃ الازہر (الازہر یونیورسٹی) جامعۃ القرویین کے بعد قدیم ترین مسلم درس گاہ ہے۔ اس کو دولت فاطمیہ نے ۹۷۰ء میں قائم کیا تھا۔ اس میں طلبہ کی تعداد ۳۰ ہزار سے زیادہ ہے۔ اسلام نے دور اول میں علم کا جو طاقتور رجحان پیدا کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعد کی تمام صدیوں میں تعلیمی کالج اور مدرسے پوری مسلم دنیا میں اسپین سے لے کر وسط ایشیا اور ہندستان تک قائم ہو گئے۔ اسپین وہ مقام تھا جہاں سے فلسفہ اور سائنس منتقل ہو کر یورپ پہنچے :

Throughout subsequent centuries, colleges and madrasahs arose throughout the Muslim world from Spain (whence philosophy and science were transmitted to the Latin West) across Central Asia to India. (9/922)

علمی ترقی اور تعلیمی توسیع کا یہ سارا کام خلافت راشدہ کے بعد اس وقت ہوا جب کہ مسلم حکمرانوں میں بگاڑ آگیا تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کے مطابق، مسلم علماء اور دانشوروں نے یہ عظیم الشان حکمت اختیار کی کہ انھوں نے "اصلاح سیاست" کے نام سے حکمرانوں سے ٹکراؤ نہیں کیا۔ انھوں

نے حکمرانوں سے تعرض نہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو ہمہ تن دینی اور سائنسی علوم کی ترقی میں لگا دیا۔ اس حکمت کی بنا پر انھیں حکمرانوں کا زبردست تعاون حاصل ہوا۔ حتی کہ اسلام کی عظیم الشان علمی تاریخ وجود میں آگئی۔ اس کے برعکس مسلم علماء اور مسلم دانشور اگر مسلم حکمرانوں سے لڑنا شروع کر دیتے تو وہ "شہداء" کی تعداد میں تو ضرور اضافہ کرتے مگر وہ اسلام کے لئے کوئی تاریخ ساز کارنامہ انجام نہیں دے سکتے تھے۔

ایک صاحب نے مجھے ایک کتاب دی۔ یہ جامعۃ الازہر کی طرف سے چھپی ہے۔ اور اس کو وسیع پیمانہ پر تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا نام ہے: واجبات الامۃ نحو کاشف الغمۃ صلی اللہ علیہ وسلم۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے امت کی ذمہ داریاں۔ میں نے اس کتاب کو دیکھا۔ اس کتاب کے مضامین کا اندازہ اس کی فہرست سے بخوبی طور پر ہوتا ہے۔ یہ فہرست حسب ذیل ہے:

الواجب الاول	الایمان بنبوتہ والتصدیق برسالتہ صلی اللہ علیہ وسلم
الواجب الثانی	طاعتہ فیما امر بہ واجتناب ما نھی عنہ صلی اللہ علیہ وسلم
الواجب الثالث	احیاء سنتہ الشریفۃ واماتۃ البدعۃ
الواجب الرابع	محبتہ وشوق لقائہ صلی اللہ علیہ وسلم
الواجب الخامس	تعظیم شانہ وتوقیرہ صلی اللہ علیہ وسلم
الواجب السادس	الصلاۃ والسلام علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
الواجب السابع	زیارۃ مسجدہ الشریف صلی اللہ علیہ وسلم

۹۴ صفحہ کی اس کتاب میں بظاہر امت محمدی کے تمام واجبات بیان کر دیئے گئے ہیں۔ مگر اس میں وہی چیز حذف ہے جو امت کے تمام واجبات میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ یعنی شہادت حق اور دعوت الی اللہ۔ سنت کے باب میں مونچھ کاٹنے اور داڑھی بڑھانے تک کی سنت کا ذکر ہے۔ مگر اس میں سنت دعوت کا کوئی ذکر نہیں۔

بعد کے دور میں لکھی جانے والی تمام کتابوں کا یہی حال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دعوت وتبلیغ کا تصور ہی امت کے زندہ شعور سے حذف ہو گیا ہے۔ حتی کہ جو لوگ بظاہر دعوت وتبلیغ کا نام لیتے ہیں وہ بھی دوسرے دوسرے کاموں کو دعوت وتبلیغ کا عنوان دیئے ہوئے ہیں۔

۱۲ اکتوبر کی صبح کو کئی عرب نوجوان میری قیام گاہ پر آ گئے۔ دیر تک ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ گفتگو کا موضوع "اسلامی دعوت عصر حاضر میں" تھا۔ ایک عرب نوجوان نے خیارکم فی الجاهلية خیارکم فی الاسلام کی تفسیر پوچھی۔ میں نے کہا کہ اس دنیا میں تحویل (conversion) کا قانون رائج ہے۔ ابتدائی لوہا پر عمل کر کے اس کو اسٹیل بنایا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کے اندر بالفعل وہ صفت پیدا ہو جاتی ہے جس کو قرآن میں بأس شدید کہا گیا ہے۔ مگر یہ بأس شدید لوہے پر عمل کر کے حاصل ہوگی مٹی یا لکڑی پر عمل کر کے آپ اس کو اسٹیل نہیں بنا سکتے۔

یہی معاملہ انسانوں کا ہے۔ جن لوگوں کے اندر قوی شخصیت موجود ہو انھیں کی تربیت کر کے ان کو اس قابل بنایا جا سکتا ہے کہ وہ بڑے بڑے کام کر سکیں۔ ضعیف شخصیت کے لوگوں پر عمل سے یہ فائدہ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے عربوں پر عمل کیا تو ان سے ابطال کا ایک گروہ وجود میں آ گیا۔ آپ نے مدینہ کے یہود پر عمل کیا مگر ان سے اس قسم کا کوئی گروہ نہ بن سکا۔ اسی طرح دور عباسیہ کے مسلمان شخصی کمزوری کا شکار ہو چکے تھے۔ اس لئے ہر قسم کی تعلیمی و تربیتی سرگرمیوں کے باوجود وہ اسلام کے قائد نہ بن سکے۔ تاتاری مفسد اور ظالم تھے۔ مگر جب وہ بدلے تو انھیں کے اندر سے وہ قوم ابھری جس نے صدیوں تک اسلام کی پاسبانی کی۔

موجودہ زمانہ کے مسلم اہل فکر کی کمزوری یہ ہے کہ وہ قوموں کے صرف "ظلم" کو دیکھ پاتے ہیں۔ ان کو قوموں کے اندر چھپے ہوئے امکانی اوصاف نظر نہیں آتے۔ اس لئے بے شمار کوششوں کے باوجود وہ ایسا نہ کر سکے کہ دوبارہ اسلام کی علمبرداری کرنے کے لئے کوئی طاقت ور گروہ وجود میں لا سکیں۔

۱۳ اکتوبر کو فجر کی نماز جدید مصر میں مسجد یوسف الصحابی (میدان الجہاز) میں پڑھی۔ نماز کے بعد اکثر نمازی مسجد میں بیٹھ گئے اور قرآن کے نسخے لے کر ہلکی آواز میں پڑھنے لگے۔ مصریوں میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ بڑے ذوق و شوق سے قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔ قومی اعتبار سے غالباً یہ بات سب سے زیادہ مصر کے اندر پائی جاتی ہے۔ غالباً اسی لئے کہا گیا ہے کہ نزل القرآن فی الحجاز وقرئ فی مصر۔

مسجد کے اندر جگہ جگہ اس مضمون کی تختی دیوار پر لگی ہوئی تھی ——— تنبیہ: ضع حذاءك وامتعتك امامك۔ (اپنا جوتا اور اپنا سامان اپنے سامنے رکھئے) قاہرہ کی کئی مسجدوں میں میں نے نماز

پڑھی۔ یہاں کی مسجدوں کا ایک خاص انداز ہوتا ہے جو دوسرے ملکوں کی مسجدوں سے مختلف ہے۔ تاہم مسجد اور اطراف مسجد میں صفائی کا معیار زیادہ اچھا نظر نہیں آیا۔

ایک عرب نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ وہ ڈیڑھ ہزار کیلو میٹر کا سفر طے کر کے صرف مجھ سے ملاقات کے لئے قاہرہ آئے تھے۔ ملاقات ہوئی تو دیر تک لپٹ کر روتے رہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ ان کے اندر حقیقت کی تلاش کی کیفیت ابھری۔ حتی کہ وہ سوچنے لگے کہ میں خودکشی کر لوں۔ پھر انھوں نے ہمارے یہاں کی عربی اور انگریزی مطبوعات پڑھیں۔ اس کے بعد انھوں نے از سر نو اسلام کی حقیقت کو دریافت کیا۔ انھوں نے کہا : عندما ادركتُ هذه الرسالة عرفت أنّ هٰذا هو الامر الحقيقي الذي كنت ابحث عنه)

یہاں اس طرح کے اور کئی عرب نوجوانوں سے ملاقات ہوئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ الرسالہ مشن کی قبولیت کا مزاج سب سے زیادہ عربوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب کا دین بعد کے اضافوں سے بڑی حد تک پاک ہے۔

مولانا عبد الباری ندوی (۱۸۹۰ - ۱۹۷۶) قاہرہ کو مقہورہ کہا کرتے تھے۔ یعنی اس کی حیثیت قاہر اور غالب کی نہیں بلکہ وہ مغربی تہذیب سے مغلوب اور مقہور ہو چکا ہے۔ میں اس سے اتفاق کرتے ہوئے اس میں یہ اضافہ کروں گا کہ یہی حال دوسرے تمام مسلم شہروں کا بھی ہے۔ حتی کہ موجودہ زمانہ کے مسلم ادارے بھی اس کیفیت سے مستثنیٰ نہیں۔ ظاہری صورت میں ضرور فرق ہے مگر اندرونی حقیقت کے اعتبار سے ایک اور دوسرے میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔

ایک مصری طالب علم عبد المجید سعد عویس نے ایک مصری مثل ان لفظوں میں بتائی : كُلْ ما يُعجبك والبس ما يُعجب الناس (کھانا اپنی پسند کا کھاؤ اور کپڑا دوسروں کی پسند کا پہنو) اس مثل سے مصری مسلمانوں کا مزاج معلوم ہوتا ہے۔ مصری مسلمان عام طور پر خوش باش ذہن کے ہوتے ہیں۔ ان کی اس صفت کا یہ فائدہ ہے کہ وہ عام طور پر تندرست ہوتے ہیں۔ مگر دوسرا نقصان یہ ہے کہ وہ معاملات پر زیادہ گہرائی کے ساتھ غور نہیں کر پاتے۔

۱۳ اکتوبر کو عشاء کی نماز میں نے یہاں کی مسجد الفرقان (تعمیر ۱۳۹۰ھ) میں پڑھی۔ یہ مسجد کافی صاف ستھری اور نمازیوں سے بھری ہوئی تھی۔ مسجد کے اندر ایک نئی چیز یہ نظر آئی کہ اس میں پلاسٹک

کے بنے ہوئے خاص انداز کے اسٹول رکھے ہوئے تھے۔ یہ معذورین کے لئے تھے۔ جن لوگوں کو کھڑے ہونے یا بیٹھنے میں زحمت ہوتی ہے۔ وہ اس اسٹول پر بیٹھ کر نماز پڑھ سکتے ہیں۔

۱۳ اکتوبر کو قاہرہ کے ایک مکان میں عرب نوجوانوں کی مجلس تھی۔ میں نے کہا کہ میں ایک جملہ کہتا ہوں آپ میں سے کوئی صاحب اس کی تشریح کریں۔ پھر میں نے کہا: البقرة هی صناعة الٰهية التی تحول اللاحليب الی حليب۔ وكذالك المومن فهو صناعة الٰهية الذی يحول اللا ايمان الی ايمان۔

جن نوجوانوں نے میرے مضامین ابھی زیادہ نہیں پڑھے تھے وہ اس سوال کو اچھی طرح سمجھ نہ سکے۔ مگر جن نوجوانوں نے میرے مضامین پڑھے ہیں وہ سوال کا مطلب سمجھ گئے اور اس کی کچھ تفسیر بھی بیان کی۔ آخر میں میں نے تفصیلی طور پر اس کی وضاحت کی۔

۱۴ اکتوبر کو ہم نے ظہر کی نماز مسجد بلال بن رباح میں پڑھی۔ یہ کافی چھوٹی مسجد تھی۔ مگر ہم تین آدمیوں کے اضافہ کے باوجود ایک صف بھی پوری نہیں ہوئی۔

راستہ میں ایک چرچ تھا۔ آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ مسیحی لوگ اس کے اندر اپنی عبادت کر رہے ہیں۔ ہم نے چاہا کہ اس کو اندر سے دیکھیں۔ لیکن گیٹ کے باہر تین مسیحی چوکیدار بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ پولیس کی وردی میں تھے۔ انھوں نے ہم کو داخلہ سے روک دیا۔ میں نے بار بار کہا کہ ہمارا مقصد صرف دیکھنا ہے۔ مگر ان لوگوں نے کسی بھی قیمت پر اندر داخل ہونے نہیں دیا۔ میں نے کہا کہ میں کئی ملکوں کے چرچوں کے اندر بلا روک ٹوک داخل ہوا ہوں۔ حتی کہ عین عبادت کے وقت چرچ کے اندر گیا ہوں۔ تاہم انھوں نے مجھ کو اندر جانے نہیں دیا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ان ملکوں میں سب سے اہم مسئلہ سیکوریٹی کا ہوتا ہے۔ ان ملکوں کا سماج سیکوریٹی اور ینڈڈ سماج ہوتا ہے۔ اس بنا پر وہ ہر آدمی کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

آتے جاتے ہوئے یہاں کے دو پارک دیکھے۔ یہ دونوں پارک جدید مصر کے تھے۔ مگر دونوں کی حالت معمولی نظر آئی۔ سیاحت کے اعتبار سے اہمیت کے مقامات پر میں نے یہاں صفائی اور دیکھ ریکھ کا اہتمام پایا۔ مگر دوسرے مقامات یا پارک ایسے نظر آئے جیسے انھیں کوئی اہمیت نہ دی جا رہی ہو۔

قاہرہ کی سڑکوں پر عورتیں کثرت سے اسکرٹ پہنے ہوئے نظر آتی ہیں۔ میں نے ایک مصری بزرگ سے پوچھا کہ یہاں اسکرٹ کا رواج کیسے شروع ہوا۔ انھوں نے کہا کہ اس کی وجہ مغربی سیاحوں کا سیلاب ہے۔ چوں کہ مصر میں کثرت سے تاریخی مقامات ہیں۔ اس لئے مغربی ملکوں کے مرد اور عورت بڑی تعداد میں سیاحت کے لئے آتے ہیں۔ ان کے اثر سے یہ بدعت یہاں شروع ہوئی۔ وہ بظاہر یہاں بطور سیاح آتے ہیں مگر اسی کے ساتھ وہ یہاں اپنی تہذیب بھی پھیلا رہے ہیں۔

میں نے کہا کہ یہ واقعہ کا ایک پہلو ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ پیاسا گویا کہ خود کنویں کے پاس آ رہا ہے۔ انسان بظاہر خواہ کچھ بھی ہو، اپنی فطرت کے اعتبار سے ہمیشہ وہ حق کا متلاشی ہوتا ہے۔ آپ اس دوسرے پہلو کو دیکھیں اور ان کو اپنا حریف سمجھنے کے بجائے ان کو اپنا مدعو سمجھیں۔ آپ ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کریں جو سچا دین ہونے کی بنا پر ہر ایک کا مطلوب ہے۔ اگر آپ اس دعوتی کام کو منظم انداز سے جدید معیار پر کریں تو جو داعی ہے وہ خود آپ کا مدعو بن جائے گا۔ یہ لوگ انشاء اللہ بڑی تعداد میں اسلام قبول کریں گے۔ یہاں تک کہ نئی تاریخ وجود میں آجائے گی۔

۱۴ اکتوبر کو قاہرہ سے روانگی کا دن تھا۔ فجر کی نماز مسجد الفرقان میں پڑھی۔ وہاں پہنچا تو دروازہ کے باہر نوٹس بورڈ پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا: اخی المصلی، ضع متاعك امامك مسجد اس لئے تھی کہ آدمی اپنا سامان اپنے پیچھے چھوڑ کر بھی اپنے آپ کو محفوظ سمجھے۔ مگر آج نمازی صرف اس وقت اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا ہے جب کہ اس نے اپنا سامان اپنے سامنے رکھا ہو۔ اس قسم کے اعلانات بتاتے ہیں کہ قومی کردار کی حالت قومی عقیدہ کے مطابق نہیں۔

امام نے اپنی قرأت میں قرآن کا وہ حصہ پڑھا جس میں یہ آیت ہے: قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یأتوا بمثل ھذا القرآن لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا۔ میں نے سوچا کہ خود یہ آیت اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن خدا کی کتاب ہے۔ کیوں کہ اس قسم کی مطلق تحدی مالک کائنات کے سوا کوئی اور نہیں کر سکتا اور نہ کبھی کوئی ایسی تحدی کر سکا۔

۱۴ اکتوبر کو قاہرہ سے واپسی ہوئی۔ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ میں قاہرہ ایئرپورٹ پہنچا۔ ایئرپورٹ پر میرے قریب دو مصری مسافر آج کا اخبار الجمہوریۃ پڑھ رہے تھے میں نے

دیکھا تو اس کے صفحہ اول پر صدر مصر کی کافی بڑی اور رنگین تصویر چھپی ہوئی تھی۔ یہ مسلم ملکوں کا عام مزاج ہے۔ امریکہ اور یورپ کے اخباروں میں آپ کو اس قسم کا منظر دکھائی نہیں دے گا۔

۱۴ اکتوبر کو میں قاہرہ ایئرپورٹ پر ظہر کی نماز ادا کر رہا تھا۔ اتنے میں ایک مسافر آئے۔ انھوں نے پیچھے سے مجھے پکڑا اور گھما کر میرا رخ صحیح سمت میں کر دیا۔ میں نے سوچا کہ اسلام میں ایک مقرر "سمت قبلہ" ہے جو ہر ایک کو معلوم ہے۔ گویا اسلام میں ہر ایک کے پاس ایک معلوم کسوٹی ہے۔ ہر ایک کے لئے ممکن ہے کہ دوسرے شخص کو اس کسوٹی پر جانچے اور جس شخص میں انحراف پائے اس کو سیدھے رخ پر کھڑا کر دے۔ ایسی حالت میں نہ کسی شخص کو رخ کی تصحیح میں بخل کرنا چاہئے اور نہ کسی کو اس پر برا ماننا چاہئے کہ اس نے اس کو اسلام کی کسوٹی پر جانچا اور اس کے رخ کو صحیح سمت میں پھیرنے کی کوشش کی۔

گلف ایئر کی فلائٹ نمبر ۷۴ کے ذریعہ قاہرہ سے واپس روانگی ہوئی۔ جہاز کے اندر گلف ایئر کا فلائٹ میگزین گولڈن فالکن (Goldenfalcon) کا شمارہ اکتوبر ۱۹۹۱ دیکھا۔ اس کے ایک مضمون میں بتایا گیا تھا کہ انگریزی زبان میں عربی کے سیکڑوں الفاظ ہیں جو پچھلے ایک ہزار سال کے دوران اس میں شامل ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ میں کچھ الفاظ درج تھے۔ مگر ان میں سے بہت کم الفاظ براہ راست عربی سے انگریزی میں داخل ہوئے ہیں۔ زیادہ تر فرانس اور اٹلی وغیرہ کے راستہ سے انگریزی میں پہنچے ہیں۔ اس سے اس علاقہ میں عرب۔ اسلامی تہذیب کی فوقیت کا اندازہ ہوتا ہے جو اس کو سائنسی میدان میں حاصل تھی:

The preponderance of technical or scientific words entering English from Arabic during the Middle Ages suggests the general superiority of Arab-Islamic civilisation in the area of scientific achievement during this period. (p. 24)

عجیب بات ہے کہ عربی زبان کی برتری کا تذکرہ کرنے والے ماہنامہ کا نام انگریزی "گولڈن فالکن" کہا گیا ہے۔

طیران الخلیج (گلف ایئر) کے فلائٹ میگزین (Goldenfalcon) کا شمارہ اکتوبر ۱۹۹۱ دیکھا۔ اس کے مذکورہ مضمون میں بتایا گیا تھا کہ انگریزی کے بہت سے الفاظ عربی زبان سے لئے گئے

ہیں۔ مثلاً صفر (cipher) اور لیمون (lemon) وغیرہ۔ مضمون نگار نے اس سلسلہ میں تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ قرون وسطیٰ میں ۵۰۰ سال تک عربی علم اور عربی کلچر اور فکری ترقی کی زبان بنی رہی:

for 500 years Arabic was the language of learning, culture and intellectual progress.

یہ الفاظ پڑھ کر میں سوچنے لگا کہ جب ماضی ایسا تھا تو موجودہ زمانہ کے مسلمان اس سے مختلف کیوں ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ سمجھ میں آئی کہ موجودہ مسلمان قدیم مسلمانوں کا تسلسل نہیں ہیں، وہ قدیم مسلمانوں کی اگلی نسلیں ہیں۔ قدیم مسلمانوں کے اندر مذکورہ انقلابی صفت اس لئے آئی تھی کہ ان کا ایمان ان کے لئے ذہنی انقلاب کے ہم معنی تھا۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو اگر اٹھانا ہے تو ان کے ایمان کو دوبارہ ذہنی انقلاب بنانا پڑے گا۔ اس ابتدائی عمل کے بغیر محض جذباتی الفاظ بولنے سے موجودہ مسلمانوں میں ماضی والے مسلمانوں کی صفت آنے والی نہیں۔

درمیان میں ہمارا جہاز تقریباً ایک گھنٹہ کے لئے دوحہ میں رکا۔ یہ قطر کی راجدھانی ہے۔ ۱۹۶۷ تک اس کی حیثیت ایک معمولی بستی کی تھی۔ ۱۹ویں صدی کے آخر میں عثمانیوں نے یہاں اپنا قبضہ قائم کیا۔ ۱۹۱۶ سے ۱۹۷۱ تک وہ برطانیہ کے دائرہ اثر میں رہا۔

۲۰ویں صدی کے آغاز میں دوحہ کے ساحل پر ۳۵۰ سمندری موتی نکالنے والی کشتیاں (pearling boats) تھیں۔ اس وقت تک موتی نکالنا یہاں کا خاص کاروبار تھا۔ مگر اس کے بعد جاپان کے مصنوعی موتی (cultured pearls) بازار میں آگئے۔ بظاہر اصلی موتی ہونے کے باوجود وہ بہت سستے تھے۔ چنانچہ اس کے بعد دوحہ کی موتیوں کی تجارت ختم ہو گئی۔

مگر دوسری عالمی جنگ کے بعد یہاں پٹرول نکالنے کے کارخانے قائم ہو گئے۔ اور اب قطر ایک انتہائی دولت مند ملک سمجھا جاتا ہے۔ اب یہاں قدیم مٹی کے گھروں کے بجائے جدید طرز کے عالیشان مکانات کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی دنیا میں ترقی کے بے پناہ امکانات رکھے ہیں۔ یہاں ایک امکان کے ختم ہوتے ہی دوسرا اس سے بڑا امکان سامنے آجاتا ہے۔ فطرت کا یہ قانون زمین کے مادی خزانوں کے لئے بھی ہے اور انسانی زندگی کے لئے بھی۔

عرب امارات (United Arab Emirates) کی فیڈریشن ۱۹۷۱ میں بنی۔ اس میں سات چھوٹی ریاستیں شامل ہیں۔ ان کی مجموعی آبادی دو ملین سے بھی کم ہے۔ ابوظبی اس فیڈریشن کا صدر مقام ہے۔ شیخ زائد کی رہنمائی میں فیڈریشن نے "ایجوکیشن اوریینٹڈ بجٹ" بنایا ہے۔ وہ اپنی آمدنی کا ۴۱ فیصد حصہ تعلیم پر خرچ کر رہے ہیں۔

یہ بلاشبہ ایک دانشمندانہ طریقہ ہے۔ موجودہ دور معلومات کا دور (information age) ہے۔ معلومات تک رسائی صرف اہل علم کو ہو سکتی ہے۔ اس لئے قوم کو حصول علم میں آگے بڑھانا دور جدید میں ترقی کے لئے انتہائی ضروری ہے۔

تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دینے کا یہ نتیجہ ہے کہ عرب امارات اور ابوظبی میں اعلیٰ تعلیم یافتہ عرب نوجوانوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ دہلی کے انگریزی اخبار ہندستان ٹائمس (۱۷ دسمبر ۱۹۹۱) میں عرب امارات کے حالات پر ایک جائزہ چھپا ہے۔ جائزہ نگار نے ابوظبی کے ایک بڑے تاجر سلطان بن سلیمان (۳۶ سال) سے ملاقات کی۔ اس نے لکھا ہے کہ سلطان بن سلیمان انگریزی بھی اتنی ہی اچھی بولتے ہیں جتنا کہ عربی:

He is as articulate in English as he is in Arabic.

عرب امارات کے اکثر شعبوں میں ابھی تک برٹش لوگ کثرت سے موجود ہیں۔ میں نے ایک شیخ سے پوچھا کہ برٹش افراد اس طرح کب تک یہاں رہیں گے۔ انھوں نے جواب دیا کہ اس معاملہ میں ہم نے تدریج کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ہم اپنے نوجوانوں کو بڑے پیمانہ پر جدید تعلیم دلا رہے ہیں۔ امید ہے کہ اس صدی کے آخر تک ہمارے نوجوان تربیت پاکر ان شعبوں کو سنبھال لیں گے جن کو آج زیادہ تر انگریز سنبھالے ہوئے ہیں۔ اس طرح کے معاملہ میں یہی طریقہ درست ہے۔ جو لوگ انقلابی جوش میں دفعۃً تمام بیرونی افراد کو خارج کر دیتے ہیں وہ ہمیشہ اس قیمت پر ہوتا ہے کہ کارکردگی کا معیار تباہ ہو کر رہ جائے۔

ایک مسافر نے مجھے بتایا کہ ایک بار وہ ابوظبی ایئرپورٹ پر تھا۔ ایک عرب لڑکی آکر پاس کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ مسافر نے اس سے عربی میں ایک سوال کیا۔ لڑکی نے روانی کے ساتھ انگریزی میں جواب دیا۔ مسافر نے کہا کہ تم انگریزی جانتی ہو۔ اس نے فوراً جواب دیا کہ بے شک (of course)

گلف ایئر کی سروس اچھی تھی۔ تاہم دوحہ اور ابوظبی دونوں جگہ اس کی لینڈنگ ایسی تھی جس کو رف لینڈنگ ہی کہا جائے گا۔ سفر کے دوران ہموار پرواز کا انحصار موسم پر ہوتا ہے۔ اور لینڈنگ کے وقت ہموار لینڈنگ کا انحصار پائلٹ پر۔

دوحہ (قطر) سے نکلنے والے عربی اخبار العرب کا شمارہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۹۱ دیکھا۔ اس کی ایک خبر کا عنوان تھا: ۲۷۰۰ لغة فی العالم (دنیا میں ۲۷۰۰ زبانیں ہیں)، اس میں ترکی کے ذرائع سے بتایا گیا تھا کہ ساری دنیا میں مروجہ زبانوں کی مجموعی تعداد ۲۷۰۰ تک پہنچتی ہے۔ ان میں سب سے زیادہ استعمال کی جانے والی زبانیں یہ ہیں ــــ چینی، انگریزی، اسپینی، ہندی، ترکی۔

اس خبر کو پڑھ کر میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور پھر اس کی مناسبت سے نظیر اکبرآبادی کا یہ شعر یاد آگیا:

ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

خبر کو پڑھ کر میرے ذہن میں کیا خیال آیا تھا، اس کو میں ناظرین کے اوپر چھوڑتا ہوں۔ جو لوگ میری تحریریں برابر پڑھتے رہے ہیں ان کے لئے اس کو قیاس کرنا مشکل نہیں۔

دوحہ کا دوسرا عربی اخبار الشرق (۱۴ اکتوبر) بھی دیکھا۔ اس کے صفحہ اول کی ایک خبر یہ تھی کہ شاہ حسین آرام کرنے کی خاطر اردن کے تخت کو چھوڑنے کے بارہ میں سوچ رہے ہیں (حسین یفکر فی التخلی عن عرش الاردن)

خبر میں بتایا گیا تھا کہ اردن اس وقت سخت ترین اقتصادی اور اجتماعی مشکلات سے دوچار ہے۔ ان ذمہ داریوں کو سنبھالنا شاہ حسین کے لئے سخت دشوار ہو رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ملک کی حکومت پر باقی رہنے کے سوال نے ان کو ناقابل برداشت مصیبت میں ڈال دیا (ان مسئلة الاستمرار فی الحکم قد ارهقته)

شاعر نے کہا ہے کہ: جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے۔ جو شخص جتنے بڑے مرتبہ پر ہو اتنا ہی زیادہ وہ مشکلات میں مبتلا ہوتا ہے۔ یہ اصول شاہ اردن کے لئے جتنا درست ہے اتنا ہی وہ شاہ امریکہ کے لئے بھی درست ہے۔ اس میں کسی کا کوئی استثناء نہیں۔

جہاز میں ایک نئی بات یہ تھی کہ عربی اور انگریزی کے ساتھ ہندی زبان میں بھی اعلانات کئے

جارہے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس جہاز میں کافی ہندستانی مسافر ہوتے ہیں۔

اس کا محرک تجارت تھا۔ تجارتی مفاد کی بنا پر جہاز کے ذمہ داروں نے اپنے اعلانات کی زبان میں ہندی کو شامل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ تجارتی محرک لوگوں کو مجبور کر رہا ہے کہ وہ اپنے گاہک کی زبان میں بولیں۔ حق کے حاملین کے لئے دعوت کا محرک اتنا طاقت ور نہ بن سکا کہ وہ مدعو کی زبان میں بولنے کا اہتمام کریں۔

جہاز میں انگریزی روزنامہ (Emirates News) کا شمارہ ۱۴ اکتوبر دیکھا۔ اس کے صفحہ آخر پر کویت کے شاہی خاندان کی ایک خاتون (سعد عبداللہ السالم الصباح کی اہلیہ) کا انٹرویو تھا۔ انھوں نے کہا کہ کویت پر عراق کے حملہ نے اختلافات ختم کر دئے۔ ہمارے عوام کو باہم قریب کر دیا۔ اس قسم کی قربت صرف اقتصادی خوش حالی سے پہلے تھی جب کہ لوگ کچے گھروں میں رہتے تھے:

The invasion brought our people close together. Such a closeness existed only before the economic boom when people lived in mud houses. (p. 12)

اس کو میں نے پڑھا تو میری زبان پر یہ الفاظ آگئے ——— مصیبت کے وقت تو حیوانات بھی اپنا اختلاف ختم کر دیتے ہیں۔ انسان کی صفت یہ ہے کہ وہ خوش حالی اور اقتدار کے وقت اپنے اختلافات کو ختم کر دے۔

دبئی کا انگریزی روزنامہ گلف نیوز (۱۴ اکتوبر) دیکھا۔ اس میں مختلف ملکوں کی خبر کے لئے صفحات مقرر تھے۔ مثلاً عرب امارات، مڈل ایسٹ، یونائٹڈ کنگڈم، ایسٹ ایشیا، یو ایس اے۔ امریکہ کے صفحہ پر ایک تصویر میں دکھایا گیا تھا کہ عورتوں اور مردوں کی بھیڑ اپنے ہاتھ میں بڑے بڑے لفافے لئے ہوئے ہے اور ان کو ایک خاص ڈاک خانہ میں جلد از جلد پوسٹ کر دینے کی منتظر ہے۔ تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا:

Crowds of people wait in line to mail applications for a lottery of 40,000 Green Cards at the Merrifield post office in suburban Virginia. The State Department is accepting the first 40,000 applications that arrive at its special post office box after 12 a.m. today in the first of three annual massive giveaways of Green Cards on a first come first serve basis—Reuter.

اس کو پڑھتے ہوئے دل تڑپ اٹھا۔ میں نے کہا کہ امریکہ کے گرین کارڈ کو حاصل کرنے کے لئے لوگ ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ مگر جنت کے گرین کارڈ کی کھڑکی خالی پڑی ہوئی ہے۔ وہاں کوئی لائن میں کھڑا ہونے والا نہیں۔

اس کے بعد ہمارا جہاز کچھ دیر کے لئے ابوظبی میں اترا۔ تمام مسافر ہوائی جہاز سے نکل کر ایرپورٹ پر آ گئے۔ تقریباً ایک گھنٹہ ابوظبی میں گزرا۔ ابوظبی ایئرپورٹ کی پوری چھت خیمہ کے انداز پر بنائی گئی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے کہ اسلام آباد (پاکستان) کی فیصل مسجد کی چھت بنائی گئی ہے۔ تاہم یہ طرز تعمیر مجھے ذاتی طور پر پسند نہیں۔ میں اس کو سطحی ذوق کی علامت سمجھتا ہوں۔

ابوظبی، عرب امارات کی سات ریاستوں میں سب سے بڑی ریاست ہے۔ اس کا رقبہ ۲۶ ہزار مربع میل ہے۔ وہ اور دبئی عرب امارات کی سب سے زیادہ دولت مند ریاستیں سمجھی جاتی ہیں۔

ڈھائی سو سال پہلے ابوظبی کی حیثیت زیادہ تر غیر آباد صحرا کی تھی۔ ۱۷۶۱ء میں قبیلہ بنی یاس کو یہاں پانی کا کنواں ملا۔ اس کے بعد وہ یہاں رہ پڑا۔ اسی قبیلہ کا ایک خاندان اب تک یہاں حکمراں ہے۔ ۱۹۵۸ میں یہاں پٹرول دریافت ہوا۔ اس کے بعد سے ابوظبی نے عالمی اہمیت حاصل کر لی۔ پانی کی دریافت نے ابوظبی کو صرف قبائلی اہمیت دی تھی۔ تیل کی دریافت نے اس کو عالمی سطح پر اہمیت کا حامل بنا دیا۔

پانی ایک سادہ انسانی ضرورت ہے۔ ایک معمولی دیہاتی آدمی بھی پانی کو دیکھے تو وہ اس کی اہمیت اور اس کے استعمال کو جان لے گا۔ مگر پٹرول کی اہمیت اور اس کے استعمال کو جاننے کے لئے صرف اس کو دیکھنا کافی نہیں۔ اس کے لئے مزید ایک پوری صنعتی تہذیب کی ضرورت ہے۔ یہی فرق ہے جس کی بنا پر پانی دریافت ہوا تو اس کا پورا فائدہ عرب قبیلہ کو ملا۔ مگر تیل دریافت ہوا تو اس کا بیشتر فائدہ مغربی قوموں کے حصہ میں چلا گیا۔

۱۴ اکتوبر کو ابوظبی سے دہلی کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ سفر خلیج ایئر کے جہاز کے ذریعہ طے ہوا۔ راستہ میں شارقہ کا عربی روزنامہ الخلیج (۱۴ اکتوبر ۱۹۹۱) دیکھا۔ اس کے صفحہ ۶ پر ایک مضمون (النظام العربي وآفاق المستقبل) تھا۔ اس میں الامة العربية کو مخاطب کرتے ہوئے کچھ باتیں کہی گئی تھیں۔

اس ذیل میں مضمون نگار (علی ربیعہ) نے لکھا تھا کہ صحرا کے قافلے جس قاعدہ کا اتباع کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ اپنے اندر کے سب سے کمزور کی چال چلو (سیر وا سیر اضعفکم) میں نے اس کو پڑھا تو میرے دل نے کہا کہ یہ اصول صرف صحرائی سفر کے لئے نہیں ہے بلکہ زندگی کے تمام سفروں کے لئے ہے۔

مثلاً آپ کو شہر کی سڑک پر ایک جلوس نکالنا ہے۔ آپ کی جماعت میں ۹۵ فیصد ایسے لوگ ہیں جن کے اندر برداشت کی طاقت ہے۔ مگر ۵ فیصد افراد میں برداشت کی طاقت نہیں۔ ایسی حالت میں آپ کو ۵ فیصد کا لحاظ کرتے ہوئے جلوس نہیں نکالنا چاہئے۔ کیوں کہ جلوس کے پانچ فیصد افراد بے برداشت ہو کر تشدد کر بیٹھیں گے اور پھر آپ کا جلوس ملت کو فائدہ پہنچانے کے بجائے ملت کی تباہی کا سبب بن جائے گا۔

دہلی ایئرپورٹ میں داخل ہوا تو "ڈیوٹی فری شاپ" کا ایک حصہ نظر سے گزرا۔ شیشہ کی الماری کے پیچھے شراب کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف شیشہ کے اوپر خوبصورت اشتہار درج تھا۔ اوپر شراب کی دو خوبصورت بوتلوں کی تصویریں تھیں۔ اس کے نیچے یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے کہ فرسٹ کلاس سفر کا ساتھی:

First class travel companions

جن لوگوں کو "فرسٹ کلاس" کا رتبہ مل جاتا ہے، اس کے بعد ان کے لئے ساری اہمیت صرف تفریح کی رہ جاتی ہے۔ وہ شراب کو تفریح کا ذریعہ سمجھ کر اس کو اپنی زندگی کا ساتھی بنا لیتے ہیں۔ یہ زندگی کا کتنا کمتر استعمال ہے۔ زندگی کا سب سے بڑا استعمال یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو حقائق اعلیٰ کی دریافت میں لگائے۔ مگر یہی سب سے اہم چیز دنیا میں سب سے کم پائی جاتی ہے۔

ہمارے پاس کتابوں کے کئی بنڈل تھے جو قاہرہ سے ہمارے ساتھ آرہے تھے۔ کتابوں پر کسٹم وغیرہ نہیں ہوتا۔ میں نے سوچا کہ کسٹم کا عملہ ہم کو روک کر بنڈل کھلوائے گا اور پھر غیر ضروری طور پر تاخیر ہوگی۔ مگر عین اس وقت محمد حنیف صاحب اتفاقاً وہاں آگئے جو ایئرپورٹ پر بڑے افسر ہیں۔ ان کی ہدایت پر کسٹم والے نے ہم کو روکنے کے بجائے ہماری گاڑی خود لے لی اور اس کو ٹیکسی تک پہنچایا۔ میں نے سوچا کہ کاش اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بھی ایسا ہی معاملہ فرمائے اور میرے معاملہ کو اپنی رحمت سے آسان

کر دے۔

دہلی ایئرپورٹ سے ہم "پری پیڈ" ٹیکسی کے ذریعہ روانہ ہوئے۔ اس کا انتظام پولیس کی طرف سے کیا گیا ہے۔ میں نے ڈرائیور سے پوچھا کہ اس سفر کے لئے ہم نے آپ کے آفس کو ڈیڑھ سو روپے ادا کئے ہیں۔ اس میں کتنا آپ کا ہے اور کتنا دفتر کا۔ ڈرائیور نے کہا کہ دفتر فی ٹیکسی دو روپیہ لیتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ تو زیادہ رقم نہیں۔ ڈرائیور نے کہا کہ ایئرپورٹ کے لئے یہاں چار سو ٹیکسیاں ہیں اور ہر ایک ٹیکسی سے دو دو روپیہ لیتے ہیں۔ اس طرح ان کا حصہ ہم سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ چار سو ٹیکسیاں ہیں تو روزانہ ان کو ۸۰۰ روپیہ ملیں گے۔ ڈرائیور نے کہا کہ نہیں۔ ہر ٹیکسی ایک دن میں اوسطاً تین چکر ایئرپورٹ کا کرتی ہے۔ اس طرح ان کو ہر روز کم از کم ڈھائی ہزار روپے مل جاتے ہیں۔

یہ انفرادی عمل اور اجتماعی عمل کے فرق کی ایک مثال ہے۔ فرد کا حصہ ایک بار کے سفر پر ڈیڑھ سو روپیہ ہے۔ اور اجتماعی نظم کا حصہ صرف دو روپیہ۔ مگر مجموعی نتیجہ کے اعتبار سے فرد کے حصہ میں صرف ساڑھے چار سو روپیہ آیا، اور اجتماعی نظم کو ڈھائی ہزار روپیہ مل گیا۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ اجتماعیت میں برکت ہے۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۹۱ کی صبح کو میں اس وقت دہلی واپس پہنچا جب کہ یہاں کی مسجدوں سے فجر کی اذان کی آواز بلند ہو رہی تھی اور پوری فضا اس سے ہم آہنگ ہو کر بزبان خاموش یہ کہہ رہی تھی کہ رات ختم ہو گئی۔ بہت جلد افق سے نئے دن کا سورج طلوع ہونے والا ہے۔

خبرنامہ اسلامی مرکز ۸۴

۱ جناب ایم ٹی خان صاحب نے اطلاع دی ہے کہ پٹنہ میں ہم لوگ پابندی سے ہر ماہ فرسٹ سنڈے کو پروفیسر شہاب دسنوی صاحب کے مکان پر شام کے وقت اجتماع میں جمع ہوتے ہیں۔ سنیچر کا دن ہر ساتھی کو موافق نہیں آرہا تھا۔ اس لئے اتوار کا دن مقرر کیا گیا۔

۲ حیدرآباد سندھ سے جناب محمد موسیٰ بھٹو لکھتے ہیں: آپ کی کتاب "اسلام دور جدید کا خالق" کو ہم نے ترجمہ کرکے سندھی زبان میں شائع کیا ہے۔ اسے علمی حلقوں نے کافی پسند کیا ہے۔ "مذہب اور جدید چیلنج" کا تیسرا سندھی اڈیشن اس وقت پریس میں ہے۔ سندھی زبان میں اس کے دو اڈیشن پہلے چھپ چکے ہیں۔

۳ اکسپریس گروپ کے ہندی روزنامہ جن ستا کے نمائندہ نے ۲۳ اگست ۱۹۹۲ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ اس انٹرویو کا تعلق زیادہ تر مسلم مسائل سے تھا۔ ان سے کہا گیا کہ اپنی سمیا کے لئے دوسروں کو دوش دینا سمیا کو بڑھاتا ہے، اور اپنی سمیا کے لئے اپنے آپ کو دوش دینا سمیا کو حل کرتا ہے۔

۴ ایک صاحب لکھتے ہیں: ایک دوست کے ذریعہ الرسالہ سے آگاہی ہوئی۔ بیان کرنا مشکل ہے کہ پڑھ کر کتنی خوشی ہوئی اور سکون حاصل ہوا۔ فوراً الرسالہ کو ایک سال کے لئے جاری کروایا اور اب تک تقریباً تمام دوستوں کے نام الرسالہ جاری کروا چکا ہوں۔ الرسالہ کی جملہ سب سے زیادہ پسند آئی وہ اس کا غیر جذباتی پن ہے۔ اس کی بے آمیز دعوت ہے جو فوراً دل کو اثر کرتی ہے (امانت اللہ انصاری، کراچی)

۵ مولانا اے ندوی نے اطلاع دی ہے کہ الرسالہ کے مضامین اور اس کی مختلف مطبوعات کا آسامی زبان میں ترجمہ کرکے شائع کر رہے ہیں۔ آجکل وہ پیغمبر انقلاب کا آسامی زبان میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں اگر کچھ لوگ تعاون کرنا چاہیں تو ان سے حسب ذیل پتہ پر خط و کتابت فرمائیں:

Mohammad Afazuddin Nadvi, V. Niranchuba,
Patharighat 784144, Distt. Darrang (Assam).

۶ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی گئی۔ یہ سیرت کے موضوع پر تھی

اور اس کا عنوان تھا: نبی رحمت۔ اس میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمۃ للعالمین ہونے کی حیثیت کو واقعات کی روشنی میں واضح کیا گیا۔

۷ بعض اداروں کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے ستمبر ۱۹۹۲ میں یورپ اور افریقہ کے کچھ ملکوں کا سفر کیا۔ یہ ایک علمی اور دعوتی سفر تھا۔ اس کی تفصیلی روداد انشاء اللہ آئندہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۸ ایک صاحب لکھتے ہیں: آپ کی گراں قدر تصنیفات پڑھنے کا اتفاق ہوا دل میں ایک ہلچل پیدا کرنے والی کتابیں ہیں جو انسان کو صحیح راہ دکھاتی ہیں اور خاص کر الرسالہ تو ایک روشنی کا مینارہ ہے جو اس زمانے میں لوگوں کو سیدھے راستہ پر چلنے کی تلقین کر رہا ہے جو اسوۂ رسول کی طرف جاتا ہے اور فطرت انسانی کی تڑپ ہے۔ (محمد شفیع، کراچی)

۹ جناب ایم ٹی خان صاحب پٹنہ سے لکھتے ہیں: میری فیملی کے لئے الرسالہ ایک ماہانہ متوازن خوراک ہے۔ ہر ماہ ہم لوگ ذہنی طور پر صحت مند ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کا احساس اپنی زندگی کی گاڑی کی بہتری دیکھنے سے ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پہلی بار سماج کو آپ کے ذریعہ صحیح طریقہ حاصل ہو رہا ہے۔ ایک کامیاب عملی زندگی کے لئے دانائی و حکمت کی اہمیت کو نظر انداز کرنے سے مذہب صرف عقیدہ کا دوسرا نام رہ جائے گا۔ آپ کے مشن کے ذریعہ قوم و سماج میں مذہب کا عملی پہلو سامنے آ رہا ہے۔

۱۰ ایک صاحب لکھتے ہیں: میں الرسالہ کا مطالعہ ۱۹۹۰ سے مستقل طور پر کر رہا ہوں اور الرسالہ کے خاص نمبروں (روشن مستقبل، خلیج ڈائری، عظمت صحابہؓ) کو بہت ہی جذبہ کے ساتھ بار بار پڑھتا رہتا ہوں۔ اس کے علاوہ خاتون اسلام، پیغمبر انقلاب بھی زیر مطالعہ ہے۔ اور جیب اور دل و دماغ کی ڈائری میں محفوظ کرنے والی پاکٹ سائز اقوال حکمت بھی میرے پاس موجود ہے۔ اور آپ کے دیگر تمام مطبوعات بھی پڑھنے کے لئے جہاں بھی جاتا ہوں، دل میں تمنا لئے رہتا ہوں۔ میں بلاشبہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے سیرت رسولؐ پر، پیغمبر انقلاب اور اصحاب رسولؐ پر عظمت صحابہؓ لکھ کر حق تبلیغ ادا کر دیا۔ اس کار خیر کے لئے اللہ تعالیٰ آپ کو اجر عظیم عطا فرمائے (محمد حامد حسین، چمپارن)

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs 60	ایک سال	$20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs 110	دو سال	$35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs 150	تین سال	$50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	Rs 240	پانچ سال	$80 / £40	$40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 300	خصوصی تعاون (سالانہ)	$100 / £50	

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے ہانس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر　مولانا وحیدالدین خاں کے قلم سے

اردو

تذکیرالقرآن جلد اول	200/-
تذکیرالقرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبر انقلاب	40/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمتِ قرآن	30/-
عظمتِ اسلام	6/-
عظمتِ صحابہ	6/-
دینِ کامل	50/-
الاسلام	40/-
ظہورِ اسلام	40/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاء اسلام	20/-
رازِ حیات	60/-
صراطِ مستقیم	40/-
خاتونِ اسلام	45/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصرِ حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروانِ ملت	45/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	25/-
حدیثِ رسولؐ	35/-
ڈائری جلد اول	95/-
ڈائری جلد دوم	
سفرنامہ (ملکی اسفار)	
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	95/-
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	20/-
راہِ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	50/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
اقوالِ حکمت	20/-

انوارِ حکمت	20/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدیدِ دین	20/-
عقلیاتِ اسلام	30/-
مذہب اور سائنس	20/-
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	5/-
اسلام دینِ فطرت	6/-
تعمیرِ ملت	6/-
تاریخ کا سبق	6/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارفِ اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	6/-
ایمانی طاقت	6/-
اتحادِ ملت	6/-
سبق آموز واقعات	6/-
زلزلۂ قیامت	8/-
حقیقت کی تلاش	6/-
پیغمبرِ اسلام	5/-
آخری سفر	6/-
اسلامی دعوت	6/-
خدا اور انسان	6/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	5/-
دینی تعلیم	6/-
حیاتِ طیبہ	6/-
باغِ جنت	6/-
نارِ جہنم	6/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	6/-
شخصیاتِ اسلام	–
تعددِ ازواج	3/-

روشن مستقبل	6/-
صوم رمضان	6/-
علم کلام	6/-
صداقتِ اسلام	–
علماء اور دورِ جدید	–
ہندستانی مسلمان	6/-
سیرتِ رسولؐ	
اسلام ایک عظیم جدوجہد	3/-
ہندستان آزادی کے بعد	1/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	7/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	4/-
اسلام کا تعارف	2/-

ہندی

سچائی کی تلاش	6/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
پیغمبرِ اسلام	3/-
منزل کی اور	3/-

عربی :

الاسلام یتحدیٰ	85/-
الاسلام والعصر الحدیث	55/-

آڈیو کیسٹ

A-1	حقیقتِ ایمان	25/-
A-2	حقیقتِ نماز	25/-
A-3	حقیقتِ روزہ	25/-
A-4	حقیقتِ زکوٰۃ	25/-
A-5	حقیقتِ حج	25/-
A-6	سنتِ رسولؐ	25/-
A-7	میدانِ عمل	25/-
A-8	پیغمبرانہ رہنمائی	25/-
A-9	اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
A-10	اسلامی اخلاق	25/-
A-11	اتحادِ ملت	25/-
A-12	تعمیرِ ملت	25/-
A-13	نصیحتِ لقمان	25/-

تذکیرالقرآن کیسٹ (تلاوت، ترجمہ و تفسیر)

A-14	متفرق سورتیں ۱	30/-
A-15	متفرق سورتیں ۲	30/-
A-16	متفرق سورتیں ۳	30/-

ویڈیو کیسٹ

V-1	پیغمبر انقلاب	200/-
V-2	اسلام داعیِ امن	200/-
V-3	اسلام دورِ جدید کا خالق	200/-
V-4	امتِ مسلمہ اور جدید چیلنج	200/-
V-5	اسلام اور سماجی انصاف	200
V-6	اسلام اور دورِ حاضر	200/-

God Arises	75/-
Muhammad The Prophet of Revolution	75/-
Islam As It Is	40/-
God Oriented Life	60/-
Words of the Prophet	–
Introducing Islam	–
Religion and Science	30/-
Tabligh Movement	20/-
Islam the Voice of Human Nature	–
Islam the Creator of Modern Age	–
The Way to Find God	5/-
The Teachings of Islam	6/-
The Good Life	6/-
The Garden of Paradise	6/-
The Fire of Hell	6/-
Man Know Thyself!	4/-
Muhammad The Ideal Character	5/-
Social Justice in Islam	–
Words of Wisdom	–

فائل الرسالہ اردو (مجلد)

سال 1982	80/-
1985	80/-
1986	80/-
1987	80/-
1988	80/-
1989	80/-
1990	80/-
1991	80/-

فائل الرسالہ انگریزی (مجلد)

1984 تا 1991　80/- فی جلد

فائل الرسالہ ہندی (مجلد)

1990-91　85/-